سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تو عام طور سے مشہور ہی، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی، جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، اتمامیں حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہی، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایاتِ صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہی کہ اس میں قرآنِ پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہی اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہی،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ہے، تقطیع خورد صہ و ہے، حصہ سوم تقطیع کلان ہے، وللعہ، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلان عہ، و سے، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ، وللعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

عدد ۶	ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۸ء	جلد ۴۱

مضامین

شذرات

میں دو مہینوں سے دفتر سے دور ہوں، اس مہینہ کے شذرات کے صفحے لکھ کر ۹ جون کو دفتر بھیجے گئے تھے، مگر افسوس ہے کہ وہ ڈاک میں ضائع گئے، جس کی اطلاع ۱۸ کی شام کو مجھے ہوئی، اب ۱۹ کی پچھلی رات کو یہ صفحے لکھ کر دوبارہ بھیجے جارہے ہیں، اس اتفاقی بلکہ جبری تاخیر کی معافی چاہتا ہوں،

خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے، مختلف صوبوں میں اس کے لئے جد وجہد کا آغاز ہو رہا ہے، صوبہ بہار میں جہاں آجکل میرا قیام ہے، بعض نوجوان اس کے لئے کچھ محنت بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ کسی ایک خاص نظام اور کسی ایک خاص نصاب اور طریقہ تعلیم کی یکسانی کے ساتھ اس کام کو چلایا جائے،

صوبہ بہار کے وزیر تعلیم آنریبل ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے صوبہ میں اردو اور ہندی کی ابتدائی تعلیم پھیلانے اور ہندوستانی زبان کو باقاعدہ تعلیمی زبان بنانے کی جو کوششیں کی ہیں، وہ بہت کچھ قدر کے لائق ہیں، نوجوان طالب علم جہالت کے خلاف جہاد کرنے میں مصروف ہیں، ہندی اور اردو دونوں کی چند ہفتوں میں تعلیم کے نقشے بن گئے ہیں جن کے ذریعہ سے تعلیم دیجارہی ہے، ہندوستانی زبان کے لئے لغت اور قواعد کی کتابوں کے بنانے کا کام انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی ایکاڈیمی کے سکریٹریوں کے سپرد ہوا ہے، اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب اس کام کو انجام دے رہے ہیں،

مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے جو اب تک صرف عربی کتابوں کو چھاپتی تھی اپنی ترقی کا دوسرا قدم بڑھایا ہے، اس نے ایک عربی اور اسلامی علوم وفنون کی ایکاڈیمی کی شکل اختیار کی ہے، اور اس غرض سے ۹-۱۰-۱۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد میں وہ اپنا ایک سالانہ اجلاس کر رہی ہے، جس میں ملک کے متعدد علماء اور محققین علوم اسلامیہ اپنے اپنے تحقیقی مقالے پیش کرینگے، خدا کرے کہ اس کی ترقی کا یہ نیا قدم مسعود و مبارک ہو،

لاہور کا ادارہ معارف اسلامیہ جو ہر دوسرے سال اپنا اجلاس کرتا ہے، امسال دہلی میں دسمبر میں اپنا اجلاس کرے گا، امید ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے اہل علم اس میں شرکت کرینگے، ادارہ کے متعلق کئی سال سے کوششیں ہو رہی تھیں کہ وہ لاہور کے علاوہ وقتاً فوقتاً اپنے قدم سے دوسرے شہروں کی بھی رونق بڑھائے، ادارہ کا یہ موجودہ فیصلہ تعریف کا مستحق ہے، اور جب وہ دہلی تک قدم رنجہ فرما چکا ہے تو پھر آیندہ اس کو لکھنؤ اور پھر اعظم گڈھ تک آنے میں کیا زحمت ہو سکتی ہے،

یورپ کی اورنٹیل کانفرنس کا آیندہ اجلاس ۵-۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو بلجیم میں ہو رہا ہے، حسب معمول اس دفعہ بھی اس کے نو شعبے ہونگے، اسلامیات، یہودیات، عیسائی مشرق، مصریات، اشوریات وسط ایشیا، مشرق بعید مع جاوا، ہندیات اور سامی قومیں اور زبانیں ہیں، شعبہ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر وتک مقرر ہوئے ہیں،

یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ مصریہ کی انجمن تالیف واشاعت (لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر) نے ہمارے ہندی حیدرآبادی دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے خواہش کی ہے کہ وہ عربی میں مسلمانوں کی ابتدائی سیاست خارجہ پر ایک کتاب لکھیں، موصوف نے یہ خواہش منظور کرلی ہے، اور امید ہے کہ سال کے ختم تک اُن کا یہ کام انجام کو پہنچے، یہ کتاب ان کی شائع شدہ فرانسیسی کتاب سے الگ ہوگی،

جاپان میں اسلام کا آفتاب اپنی کرنیں پھیلا رہا ہے، جاپان کے شہر کوبے میں ہندوستانی تاجروں کی کوشش سے ایک مسجد تیار ہو چکی ہے، کوبے کی مسجد کے ارکان یہ کوشش کر رہے تھے کہ جاپان کی حکومت مسجد کو مسلمانوں کی عبادت گاہ تسلیم کرلے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی، امسال ارکانِ مسجد نے وفد کی صورت میں پایہ تخت میں آکر سلسلہ جنبانی کی اور مزید کوشش کے لئے راستہ صاف کر دیا،

پروفیسر برلاس دہلوی نے جو اس وفد میں شریک تھے، اس وفد کا مختصر حال لکھ کر آیندہ مفصل لکھنے کا وعدہ کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ "کوبے میں مسجد بن جانے کے بعد ٹوکیو میں مسجد کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی، مگر ٹوکیو میں نہ مسلمانوں کی اتنی تعداد ہے اور نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ وہ تنہا مسجد بنا سکیں، چند ہمدرد جاپانی مدبرین کو اس کا احساس ہوا تو انھوں نے بعض مخیر جاپانی حضرات سے روپیہ جمع کر کے سوا لاکھ ین کی لاگت سے ایک مسجد اور اسی سے ملحق ایک مدرسہ تعمیر کرانا شروع کیا، اب دونوں مکمل ہو چکے ہیں اور مئی میں ان کا باقاعدہ افتتاح ہوا، افتتاح کی رسم مسٹر ٹویامہ ایک جاپانی مدبر نے ادا کی، اور فیتہ کاٹ کر مسجد میں پہلا قدم انہی نے رکھا، انکے ساتھ تاتاری اور دوسرے مسلمان تکبیر کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور نفل نماز شکرانہ ادا کی، باہر شامیانہ میں جلسہ ہوا جسمیں جاپانی معززین اور نمایندوں میں سے بڑے بڑے لوگوں نے تقریریں کیں، مسلمانوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ اس اسلامی تقریب میں ٹرکی، ایران اور افغانستان کے نمایندے شریک نہیں ہوئے، شاید اسکی وجہ مسجد کی سیاسی حیثیت ہوگی"۔

ٹوکیو میں قربان علی ایک تاتاری لیڈر ہیں جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے حامیوں میں بیس پچیس تاتاری ہیں، باقی چار پانچ سو تاتاری جو ٹوکیو اور جاپان کے دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، ان سے سخت نالاں تھے، وہ ہنگامہ کے وسط میں گرفتار ہو گئے، اور ان کی جگہ عبد الرشید ابراہیم تاتاری کو دیدی گئی، اب ٹوکیو کی مسجد سے تاتاریوں نے جو ترک موالات کر رکھا تھا وہ دور ہو رہا ہے، کوبے کے ہندوستانی مسلمانوں نے بھی اس مسجد میں شریک ہونے کی خواہش کی تھی انھوں نے یہ جواب دیا ہے کہ مسجد اگر کلیۃً مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے تو وہ شرکت کر سکتے ہیں، مدبرین جاپان نے اسکا وعدہ کر لیا ہے، اب زمانہ اسکے ایفا کا انتظار کریگا،

مقالات

اسلامی نظامِ تعلیم

از مولینا ریاست علی ندوی

اس علمی سفر سے طالب علموں کو بڑا فائدہ یہ پہونچتا تھا، جیسا کہ ابن خلدون نے بہ تشریح لکھا ہے کہ [اس]کے زمانہ میں مختلف ملکوں کی سیاحت اور مختلف ملکوں اور شہروں کے علما کی زیارت سے انمیں علمی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی، وہ لکھتا ہے:۔

"علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے اور مشائخ سے ملنے میں تعلیم میں کمال کا اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ انسان علم، اخلاق، مذہب اور دوسری فضیلتوں کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، اور کبھی نقل، تقلید، اور میل جول سے، لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے، طالب علم پر تعلیمی اصطلاحیں بھی مشتبہ ہو جاتی ہیں، یہانتک کہ بعض طالب علم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ علم کا جزء ہیں، یہ شبہہ علما کے میل جول کے بغیر زائل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اساتذہ کے تعلیمی طریقے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے متعدد مشائخ سے ملنے سے وہ ان مختلف طریقوں کو نفس علم سے الگ کریگا، اور سمجھنے لگے گا کہ یہ صرف تعلیمی طریقے ہیں، خود علم ان سے علحدہ چیز ہے یہ اس کیلئے ہے جس کیلئے اللہ علم اور ہدایت کے راستے آسان بنا دے، اسلئے علم کی طلب میں فائدہ حاصل کرنے، مشائخ اور عام لوگوں سے مل جل کر کمال پیدا کرنے کیلئے سفر کرنا ضروری ہے"[1]

اس کے علاوہ علمی اور تعلیمی سفروں سے طالب علموں کو دوسرا فائدہ یہ پہونچتا تھا، کہ وہ گھر بار سے علحدہ ہو کر پورے سکون اور اطمینان سے علم کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۰،

کو اسی لحاظ سے سفر کرنے کا مشورہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اور اسی لئے سلف علم کی طلب میں وطن سے بے وطن ہونا، خاندان، عزیز، اقارب، اور گھربار کو چھوڑنا پسند کرتے تھے، اگر گھر بار کی فکر پڑھنے کے زمانہ میں طالب علم کے دل و دماغ پر چھائی رہی، تو اس کا دل علمی حقائق پر متوجہ نہ ہو سکے گا، کیونکہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے ہیں"[۱]

دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی

پھر طالب علم کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ وہ دنیا و مافیہا ہر چیز سے بے تعلق ہو جائے، تاکہ اسکو دماغی سکون اور ذہنی یکسوئی حاصل ہو، مثل مشہور ہے کہ

العلم لایعطیك بعضہ حتی	علم تمھیں اپنا بعض حصہ بھی نہ دیگا جب تک
تعطیہ کلہ،	تم اسے اپنا سب کچھ نہ دیدو،

خطیب نے کسی دوسرے بزرگ کا یہ قول نقل کیا ہے،

اس علم کو وہی شخص پا سکتا ہے، جو اپنی دوکان بٹھادے، اپنا باغ خراب کر دے، اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ دے، اور اگر اس کا کوئی عزیز قریب بھی مرے، تو اس کے جنازے میں نہ جائے"

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰی منیری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ جب وہ علم کی تحصیل کے لئے دہلی تشریف لے گئے، تو والدین اور عزیز و اقارب کے جو خطوط آتے، انھیں اس خیال سے نہ پڑھتے، کہ شاید کوئی بری خبر درج ہو، اور طبیعت علم کی تحصیل کی طرف سے اچاٹ ہو جائے[۲]

امام نخعی فرماتے ہیں:۔

"اگر مجھے ایک پیاز بھی خریدنے کی زحمت اٹھانی پڑتی تو میری سمجھ میں کوئی علمی مسئلہ نہ آتا"

[۱] تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۱، [۲] نزہتہ الخواطر ص ۹،

بعض شیوخ اپنے شاگردوں کے کپڑے صرف اسلئے رنگوا دیتے تھے، کہ ان کے بار بار دھونے کی فکر جاتی رہے، جس کی وجہ سے علمی مصروفیت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے،

اصل مدعا یہ ہو کہ طالب علم کے لئے پوری طرح دلی اطمینان اور ذہنی یکسوئی حاصل رہے، تاکہ اسکی تعلیمی مصروفیتوں میں خلل نہ پڑے[۱]

تجرد

اس ذہنی یکسوئی اور دلی سکون کے لئے طالب علموں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔

"طالب علم کے لئے بہتر ہے، کہ وہ کنوارا رہے، تاکہ زوجیت کے حقوق اور معیشت کی طلب کی مشغولیتیں، اوسے کمال کی طلب سے محروم نہ کر دیں"

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:۔

"جس نے شادی کرلی، وہ سمندر میں کشتی پر سوار ہو گیا، اور اگر کوئی بچہ پیدا ہو گیا، تو اس کشتی میں سوراخ بھی ہو گیا"

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

"جو شخص شادی کرنے پر مجبور نہ ہو، اس کا شادی نہ کرنا بہتر ہے، خصوصاً طالب علم کیلئے جس کی ساری پونجی، دل کے اطمینان اور بے فکری کی زندگی میں رکھی ہے"[۲]

فقر و فاقہ اور صبر و قناعت

طالب علموں کے لئے قناعت پسندی ان کا بہترین جوہر تصور کیجاتی تھی، انھیں معمولی غذا، اور سادہ اور مختصر لباس میں بسر کرنے، اور اگر فقر و فاقہ کی نوبت آئے تو صبر و استقلال سے اسے برداشت کرنے کی تلقین کیجاتی تھی،

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

[۱] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۴۲، و تذکرۃ السامع ص ۷۰، و ۷۱، و تعلیم المتعلم ص ۵۰، [۲] تذکرۃ السامع ص ۷۲،

"کوئی شخص اس علم کو ملک و دولت، عزت اور خودداری قائم رکھکر حاصل نہیں کرسکتا، بلکہ جو شخص اپنی خودی مٹا کر اور تنگ حالی میں گذار کر علماء کی خدمت کی سعادت حاصل کریگا، وہ کامیاب ہوگا، بلکہ یوں سمجھو علم کی طلب صرف نادار اور مفلس ہی کے لئے سازگار ہوسکتی ہے"

امام مالک فرماتے ہیں :-

کوئی شخص علم و دانش کے مرتبہ پر اس وقت تک نہیں پہونچ سکتا، جب تک اس پر فقر اور فاقہ کی مار نہ پڑے، اور اسے وہ ہر چیز پر ترجیح نہ دے لے،

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :-

"یہ امر (علم) اس وقت تک نہیں حاصل ہوسکتا، جب تک فقر و فاقہ کا مزا نہ چکھ لیا جائے"[1]

چنانچہ ائمۂ اسلام کے سوانح میں بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ انھوں نے تکلیف اور تنگدستی میں بسر کیا، اور صبر اور استقلال سے اپنی تعلیم جاری رکھی، ابن القاسم، حضرت ربیعہ بن سلمان کے متعلق بیان کرتے ہیں، کہ

"ربیعہ علم کی طلب میں ناداری کی اس حد تک پہونچ گئے تھے، کہ انھوں نے اپنے مکان کی چھت کی لکڑی فروخت کرڈالی، اور یہانتک کہ وہ آبادی کے گھوروں پر سے منقی اور کھجور کا فشردہ اٹھا کر کھاتے تھے"[2]

حافظ ابو محمد حجاج کی تحصیل علم کے زمانہ کا یہ واقعہ مشہور ہے، کہ جب وہ حافظ شبابہ کے یہاں درسِ حدیث کیلئے گئے تو ان کی ماں نے انھیں سو کلچے پکا کر تھیلی میں دیدیئے، وہ روزانہ ایک کلچہ نکالتے اور دجلہ کے پانی میں بھگو کر سدِ رمق کرتے، جب کلچے ختم ہوگئے، تو انھیں بھی استاد کا در چھوڑنا پڑا،[3]

حضرت بقی بن مخلد نے چقندر کے پتے کھا کر طالب علمی کا زمانہ کاٹا،[4]

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۷۱، ۷۲، مختصر جامع بیان العلم ص ۹۴، ۹۵ و تذکرۃ السامع [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۴۸، [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳۰، [4] " ص ۲۰۴،

حضرت ابو حاتم رازی نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ کپڑے بیچ کر گذارا کیا، اور جب کپڑے بھی نہ رہے، تو دو دن فاقے کے گذر گئے،[1]

ابو نصر فارابی کو طالب علمی کے زمانہ میں چراغ کا تیل میسر نہ تھا، چوکیداروں کے چراغ کے پاس بیٹھ کر پڑھتا تھا،[2] اور ابو العلاء ہمدانی مسجد کے چراغ کی روشنی میں پڑھتے تھے،[3]

مدرسہ نظامیہ بغداد کے علامہ وخشی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں :-

"میں عسقلان میں تھا، اور ابن مصحح وغیرہ سے حدیث سنتا تھا، میرے اخراجات میں تنگی ہوگئی، اور چند دن فاقے سے گذر گئے، انہی دنوں میں کچھ لکھنے بیٹھا، مگر بھوک کے غلبہ کی وجہ سے لکھ نہ سکا، تو ایک نان بائی کی دوکان کی طرف چلا گیا، اور اس کے قریب بیٹھا تاکہ روٹی کی خوشبو سونگھ کر کچھ تقویت حاصل کروں، اس کے بعد اللہ نے مجھ پر اپنی روزی کا دروازہ کھول دیا"[4]

امام شعبی سے پوچھا گیا کہ انھیں علم کیونکر حاصل ہوا، تو فرمایا :-

"اپنے اوپر اعتماد نہ کرنے، علم کے لئے سفر کرنے، گدھوں کی طرح صبر کرنے، اور کوے کی طرح صبح تڑکے اٹھنے سے"[5]

کم خوری طالب علموں کو کھانا کم کھانے کی ہدایت کی جاتی تھی، کیونکہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے، اور مطالعہ دیکھنے اور سبق یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

"میں نے سولہ برس تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا"

حضرت حسن سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۷۴، ۱، [2] عیون الانباء جلد ۲ ص ۱۳۴ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۲ [4] " جلد ۳ ص ۲۴۵ [5] " جلد ۱ ص ۱،

"غور و فکر نصف عبادت ہے، اور کم خوری عین عبادت"

حضرت سہل تستری مبالغہ کے ساتھ کہتے ہیں،

"میں قیامت کے دن کھانا چھوڑنے سے بہتر نیکی کا کوئی دوسرا کام نہیں جانتا"

پھر فرمایا:۔

"علم اور حکمت گرسنگی میں رکھے گئے ہیں، اور جہل اور معصیت پرخوری میں"

نضر بن شمیل کہتے ہیں:۔

"کوئی شخص علم سے اسوقت تک لذت نہیں پاسکتا، جب تک وہ بھوکا نہ ہو، اور علم کی محویت میں وہ بھوک کو بھول نہ جائے"

رزق حلال اور نوعیت غذا کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں طلبہ کو یہ خیال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، کہ جو چیزیں انھیں حاصل ہوں، وہ حلال کی کمائی کی ہوں، اسی طرح ایسی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کریں، جو کند ذہنی پیدا کرتی ہیں، اور ایسی غذائیں کھائیں، جو ان کے دل و دماغ کو قوت بخشیں،

کم خوابی طالب علموں کو کم سونے کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا، اگرچہ سونے کے لئے ۲۴ گھنٹوں میں سے [illegible] گھنٹوں کی اجازت تھی، لیکن عملی طور پر اہل علم و طالب علم بہت کم سوتے تھے، اور رات کا بڑا حصہ تعلیم اور مطالعہ میں صرف کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی رات کی رات گذار دیتے تھے، زرنوجی کا بیان ہے، کہ

"امام حسن بن زیاد نے ۸۰ سال کی عمر پائی، جس میں چالیس سال ایسے گذار دیئے، کہ انکی پیٹھ بستر سے نہیں لگی"

امام محمد بن حسن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ وہ رات رات بھر جاگتے تھے، اور پیالہ میں پانی

بھر کر رکھتے تھے، جب نیند آتی، تو منہ پر پانی کی چھینٹیں مار لیتے تھے، وہ راتوں کو جاگ کر مسائل حل کر لیتے اور فرماتے "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں" اور ان کے شاگرد قاضی اسد بن فرات نے بھی بیان کیا ہے، کہ امام محمد نیند سے ہشیار کرنے کے لئے ان کے منہ پر پانی کی چھینٹیں مارتے تھے،

ابو علی ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ پوری رات کبھی نہیں سویا، اور نہ دن کا بڑا حصہ مطالعہ کے سوا کسی دوسرے کام میں لگایا،[1]

وقت کی قدر و قیمت علمائے اسلام وقت کی بڑی قدر کرتے تھے، اور شاگردوں کو اسکی تلقین کیا کرتے تھے، امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:۔

"میں ان وقتوں کے کھونے پر افسوس کرتا ہوں، جو علم سے بے تعلق ہو کر کھانے پینے میں صرف ہوتے ہیں، ہمیں وقت اور زمانہ بیحد عزیز ہے"[2]

نظام اوقات طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا، کہ وہ اپنے دن رات کو چوبیس گھنٹوں میں اس طریقہ سے تقسیم کریں، کہ جس وقت جس قسم کا تعلیمی مشغلہ مناسب ہو انجام پائے، مثلاً صبح نور کے تڑکے حفظ کیلئے مقرر تھا، صبح سبق کی تکرار اور بحث کے لئے، دن چڑھے کتابت کے لئے اور شب مطالعہ اور مذاکرہ کے لئے، بعض لوگ اس سے کسی قدر مختلف نظام اوقات بھی بیان کرتے ہیں،[3]

غیر سود مند صحبتوں سے اجتناب طالب علموں کو عام معاشرتی زندگی کی چہل پہل سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خصوصاً انھیں غیر جنسوں کی صحبتوں سے علٰحدہ رکھا جاتا تھا، وہ صرف انہی لوگوں سے ملتے جلتے جن سے یا تو وہ خود فائدہ اٹھاتے، یا ان سے فائدہ اٹھایا جاتا، بلکہ اگر طالب علم کسی صحبت میں کسی علمی فائدہ کی امید میں شریک ہوتے، اور اون کی توقع اس سے پوری نہ ہوتی، تو چند دنوں کے تجربہ کے بعد اس سے

[1] تذکرۃ السامع ص ۵، تا ۱۰، [2] طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۳، ۷، وتعلیم التعلم ص ۵۰، ۵۱، ۵۲، [3] تذکرۃ السامع ص ۲، ۳، ۷،

قطع تعلق کر لیتے تھے،[1]

حفظانِ صحت کا خیال

طالب علموں کو حفظانِ صحت کے اصولوں کی تلقین کیجاتی تھی، صحت کے لئے مضر غذاؤں کے استعمال سے روکا جاتا، اور صحت بخش غذائیں اور دوائیں انھیں بتائی جاتی تھیں، اگر وہ شادی شدہ ہوتے، تو فریضۂ زوجیت کی ادائی میں اعتدال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، اسکی کثرت کے نقصانات سمجھائے جاتے تھے، نزہت گاہوں میں سیر کرائی جاتی، خصوصًا صحت کی بقا، اور جسم کی ریاضت کیلئے چہل قدمی کے معمول بنا لینے کی ہدایت کیجاتی تھی، قاضی ابن جماعہ نے ان میں سے ہر ایک کو علحدہ علحدہ تفصیل سے لکھا ہے،[2]

استاذ کی صحبتوں میں نشست،

طالب علم استاد کے درس کے حلقہ میں حاضر ہونے کے علاوہ اسکی دوسری مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اور اس کی گفتگوؤں سے علمی فائدے حاصل کرتے، مذاکروں میں تہذیب اور ادب سے حصہ لیتے، اور ان مجلسوں سے واپس اکر کار آمد باتیں لکھ لیتے تھے، اگر ان مجلسوں میں کوئی شریک نہ ہو سکتا، تو وہ اپنے ان ساتھیوں سے مذاکروں کا حال دریافت کرتا جو ان مجلسوں میں شریک رہے ہوں، نیز مجلس کے برخاست ہونے کے بعد وہ باہم ان مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے، طالب علموں کو ان مذاکروں سے بڑے فائدے پہونچتے تھے،[3]

مذاکرہ اور تکرار

طالب علم آپس میں بھی علمی مذاکرے کرتے تھے، جریر کہتے ہیں، کہ "ان کے ساتھی اعمش کے درس کے حلقہ سے اٹھنے کے بعد ان کے مکان پر اکٹھا ہوتے تھے، اور ان سے مذاکرہ کے بعد اعمش کے حلقہ کی تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے"؛

مذاکرہ کا اسقدر اہتمام تھا، کہ اگر دو طالب علم بھی جمع ہوتے، تو مختلف مسئلوں پر مذاکرہ کرتے، اور اگر دو جمع نہ ہو سکتے، تو طالب علم کو رات کی تنہائی میں فرضی طور پر کسی کو موجود قرار دیکر اس سے کسی علمی

[1] تذکرۃ السامع ص ۳ و ۵، [2] ص ۷۶، ۷۷، ۷۵، ۸۰، [3] ص ۱۴۲،

مسئلہ پر مذاکرہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، وہ خود سوال کرتا، اور اس کے تشفی بخش جواب اپنے ہی ذہن سے حاصل کرتا، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو یہی مشورہ دیا ہے،[1]

مختلف علماء کے سوانح میں ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ان کے مذاکروں کے حالات ملتے ہیں، امام ابو یوسف کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ فقہ کے مسائل پر بڑی توجہ سے فقہاء سے مذاکرہ کرتے تھے، امام اعظم رح مذاکرہ کا سلسلہ اپنی دوکان ہی پر جاری رکھتے تھے، اور کہا جاتا ہے، کہ انھوں نے علم فقہ میں اسی کے ذریعہ سے جلا پیدا کی،[2]

ابو بکر خطیب بغدادی کہتے ہیں، کہ "میں برقانی کے ساتھ حدیثوں کا کثرت سے مذاکرہ کرتا تھا، وہ اسے لکھ لیتے، اور اپنے مجموعہ میں شامل کر لیتے تھے"[3]

درس کے خالی وقتوں میں طالب علم سبق کو آپس میں مل کر دہراتے تھے، اور اسے تکرار کہتے تھے، اس سے بہت سی باتیں جو ایک طالب کو یاد نہ رہ جاتی تھیں، وہ دوسرے طالب علموں سے یاد آجاتی تھیں،

کتابوں کی تعظیم

طالب علم کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ علم کی تعظیم یہ بھی تھی، کہ کتاب کی تعظیم کیجائے، شمس الائمہ حلوائی فرماتے ہیں،:-

"میں نے یہ علم تعظیم سے حاصل کیا، میں نے کبھی کوئی کاغذ پاکی کے بغیر ہاتھ میں نہیں لیا"

طالب علموں کو کتاب کی طرف پیر پھیلانے سے منع کیا جاتا تھا، کتاب پر کوئی دوسری چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی، یہانتک کہ دوات بھی رکھی نہ جا سکتی تھی، لیکن بعض علمائے اسکی اجازت دی ہے، کہ اگر کتاب کی توہین کا خیال نہ ہو تو ایسی چیزیں کتابوں پر رکھی جا سکتی ہیں، تاہم احتیاط اولیٰ ہے،[4]

طلبہ اور ان کی کتابیں،

طالب علموں کے تعلیمی مشاغل میں کتابوں کا نقل کرنا بھی تھا، اس زمانہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کے چند ذرائع تھے، اگر طالب علم دولت مند ہوتے، تو کتابیں خریدتے یا اجرت دیکر نسخ کراتے، ورنہ کسی سے عاریۃً مانگتے، یا خود نقل کرتے،

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۴۵، [2] تعلیم المتعلم ص ۱۸، [3] ابن عساکر جلد ۱ ص ۳۹۰، [4] تعلیم المتعلم ص ۲۶،

ان مختلف شکلوں کے لحاظ سے طالب علموں اور انکی کتابوں کے متعلق حسب ذیل اصول و طریق عمل جاری تھے،

۱۔ دولتمند طالب علموں کو کتابیں خریدنے یا نسخ کرانے کا مشورہ دیا جاتا تھا، انہیں نہ خود لکھنے کی اجازت تھی، اور نہ کتابیں مستعار لینے کی،

۲۔ مستعار کتابوں پر کچھ لکھنا، حاشیہ چڑھانا، یا کوئی نشان بنانا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا،

۳۔ کتابوں کے نسخ کرنے میں چند آداب مقرر تھے،

الف:۔ خط کے حسن و خوبی میں مبالغہ کرنے، اور نوک و پلک نکالنے میں وقت ضائع کرنے سے روکا جاتا تھا، صرف خط صاف ستھرا ہونا چاہئے تھا،

ب:۔ مذہبی کتابوں کے نسخ میں ذیل کے آداب ضروری تھے، جسم طاہر ہو، کپڑے صاف ستھرے ہوں، روشنائی پاک ہو، لکھتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہو، اللہ تعالیٰ کے نام کے سامنے تعظیمی فقرے "تعالیٰ سبحانہ یا عزوجل" لکھے جائیں، آنحضرت صلعم کے نام مبارک کے آگے صلی اللہ علیہ وسلم لکھا جائے، صحابہ کے لئے "رضی اللہ عنہ" اور ائمۂ سلف کے لئے رحمہ اللہ تعالیٰ"

ج۔ سلف کے نزدیک مہین حروف میں لکھنا پسندیدہ نہ تھا، یہ مقولہ مشہور ہے کہ

"ایسا لکھو، کہ جب تمہارے پاس اسکی ضرورت کا وقت آئے تو وہ کام دے" ایسا نہ لکھو کہ بوقت حاجت یعنی ضعیفی میں ضعف بینائی کے وقت وہ تمہارے کام نہ آئے"،

امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو مہین حروف میں لکھتے دیکھا تو فرمایا،

"باریک مت لکھو، نہ اگر تم زندہ رہے تو تمہیں ندامت ہوگی، اور مروگے تو گالی سے یاد کئے جاؤگے"

۴۔ کتابت کا آغاز بسملہ کے بعد حمد و صلوٰۃ سے کیا جائے،

۵۔ جزو اور کتاب کے ختم پر خاتمہ کا نشان بنایا جائے،

۶۔ اگر کوئی عبارت مکرر ہو جائے، تو اسے قلمزد کرنے کے بجائے، اس سطر کے ذرا اوپر خطیا

نقطے دیئے جائیں،

۷۔ کتاب کے بابوں اور فصلوں کو سرخ روشنائی سے لکھا جائے، پوری کتاب کو سرخ روشنائی سے لکھنا پسند نہیں کیا جاتا تھا،

۸۔ دو سطروں کے درمیان کی جگہ میں نہ لکھا جائے،

۹۔ تصحیح شک و سوال اور کلام کے خاتمہ وغیرہ کی مقررہ علامتیں کتاب میں لکھی جائیں،

۱۰۔ کتابت کی تاریخ کو ضبط تحریر میں لایا جائے،

۱۱۔ الماری میں کتابیں علوم کی تقسیم، اور ان کی اہمیت کے اعتبار سے اوپر نیچے رکھی جائیں،

اسی طریقہ سے روشنائی اور قلم بنانے، اور چاقو کے مناسب طور پر استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ ناموں اور لفظوں کے حروف کو ضبط میں لانے، غلط کتابت کی تصحیح کرنے اصل متن پر حواشی بڑھانے کوئی اعتراض وارد کرنے یا شک رفع کرنے، کتابوں کے مطالعہ کے وقت انہیں مناسب طریقہ سے سامنے رکھنے وغیرہ کے آئین اور آداب مقرر تھے، جنھیں قاضی ابن الجماعہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے[1]،

استاذ کی اطاعت

شاگرد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ استاذ کا کامل مطیع اس طریقہ سے ہو جیسے ایک مریض ماہر طبیب کے آگے ہوتا ہے، اسے ہر وقت استاد کے چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار اور اس کی ہر قسم کی خدمت گذاری پر مستعد رہنا چاہئے، حضرت ابن عباس رض اپنی بزرگی اور مرتبہ کے باوجود حضرت زید بن ثابت رض انصاری کی رکاب پکڑ کر چلتے، اور فرماتے تھے، کہ "ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے علماء کیساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں"، حضرت شعبہ رح کہتے ہیں، کہ "میں نے جس شخص سے ایک حدیث بھی سنی زندگی بھر اس کا غلام بنا رہا"،

[1] تذکرۃ السامع از ص ۱۶۳ تا ۱۹۳،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں، کہ

"میں اس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا، اسے اختیار ہے، چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کرے، چاہے غلام بنائے رہے"۔[1]

قاضی فخرالدین ارسابندی مرو کے بڑے امام سمجھے جاتے تھے، بادشاہِ وقت ان کی تعظیم کرتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے یہ منصب استاذ کی عزت کرنے سے حاصل ہوا ہے، میں اپنے استاد ابوزید دبوسی کی خدمت کرتا تھا، ان کا کھانا پکاتا، اور اس میں سے خود نہ کھاتا تھا"۔[2]

خلیفہ ہارون رشید کا لڑکا اصمعی سے علم ادب پڑھتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ اصمعی کے مکان کی طرف سے گذرا، اور دیکھا کہ اصمعی وضو کرنے میں پاؤں دھورہے ہیں، اور شاہزادہ پانی ڈال رہا ہے، خلیفہ یہ دیکھ کر برہم ہوا، اور اصمعی سے کہا:۔

"میں نے اس لڑکے کو تمھارے یہاں ادب سیکھنے کے لئے بھیجا ہے، تم اپنا پاؤں اپنے ہاتھ سے کیوں دھورہے ہو اس سے دھلانا چاہئے تھا، ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا، دوسرے سے پاؤں دھوتا"۔[3]

استاد وشاگرد کی باہمی معاشرت اور استاذ کے ادب احترام کے آئین وطریق

قاضی ابن الجماعہ نے ایسے آداب اور آئین جنھیں اسلامی نقطہ نظر سے شاگردوں کو اپنے استاذ کے ساتھ معاشرتی زندگی میں برتنا چاہئے تفصیل سے بیان کئے ہیں، ان سے اسلامی عہد میں استاد وشاگرد کی باہمی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱- طالب علموں کا فرض ہے، کہ وہ استاذ کو عظمت کی نگاہ سے دیکھیں، اور یقین رکھیں کہ

[1] تعلیم المتعلم ص ۲۳ [2] ایضاً صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵، [3] ایضاً صفحہ ۲۵،

وہ کمال کے درجہ پر فائز ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالک کے سامنے کتاب کا ورق الٹتا تھا، تو ان کی ہیبت کی وجہ سے اس قدر آہستہ الٹتا، کہ وہ سننے نہ پاتے۔ ربیعہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے امام شافعی کے سامنے ان کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے کبھی پانی پینے کی جرأت نہ کی؛

۲- اگر استاذ کوئی حکم دینے میں غلطی بھی کرے، تو اسے صواب سمجھ کر تسلیم کرلینا چاہئے، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں اس کا اشارہ موجود ہے،

۳- استاذ کو کسی عام خطاب سے مخاطب کرنے کے بجائے "یا سیدی" یا "یا استاذی" وغیرہ سے مخاطب کرنا چاہئے، اور اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا نام تعظیمی الفاظ بڑھائے بغیر زبان پر نہ لانا چاہئے، علمائے اسلام اپنے اساتذہ کیساتھ یہی ادب برتا کئے، خواہ اپنے علم وفضل کے بلند سے بلند درجہ پر بھی فائز ہو گئے ہوں،

۴- ہر مجلس میں استاذ کی عزت اور حرمت کا لحاظ رکھنا چاہئے، اگر کسی موقع پر کوئی شخص اس کی شان میں ادب سے پیش نہ آئے، یا ناروا نکتہ چینی کرے، تو فوراً اپنی ناراضی ظاہر کرکے اس کی مدافعت کرنی چاہئے، اور اگر غیظ وغضب کے ظاہر کرنے کا موقع نہ ہو تو اس مجلس سے اٹھ جانا چاہئے،

۵- علوم وفنون میں اس کے نظریوں اور خیالوں پر عبور رکھنا چاہئے، انھیں دلنشیں رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اور اس کے مسلک کی پیروی کو اپنا شعار بنانا چاہئے،

۶- اس کی عادتوں اور خصلتوں کی پیروی کرنی چاہئے،

۷- اس کی زندگی میں اس کے لئے بھلائی کی دعا کرنی چاہئے، اور اس کی وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کرکے اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگنی چاہئے، اور اس کی اولاد اور عزیز واقارب سے محبت اور تعظیم سے پیش آنا چاہئے، کہ اصل میں یہ تعظیم اپنے استاذ کی ہوگی،

ہدایہ کے مصنف شیخ الاسلام برہان الدین بیان کرتے ہیں، کہ امام بخاری کے شیوخ میں سے

ایک بزرگ درس کی مسند پر تشریف فرما تھے، ایک مرتبہ ان کی یہ عجیب و غریب کیفیت دیکھی گئی کہ وہ درس کے درمیان میں رہ رہ کر رک جاتے ہیں، اور پھر اضطراب سے کسی کی تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے اسکا سبب پوچھا گیا، تو انھوں نے کہا،

"میرا استاذ زادہ بچوں کیساتھ گلی میں کھیل رہا ہے، وہ کھیلتے کھیلتے مسجد کے دروازہ پر آجاتا ہے، جب میری نظر پڑتی ہے، تو استاذ کی تعظیم کے خیال سے اون کے صاحبزادہ کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں" (تعلیم المتعلم)

۸- اگر استاذ کی طرف سے کوئی زیادتی یا سوء خلقی ظاہر ہو تو اس کا کوئی اثر نہ لینا چاہئے، اور اسکی وجہ سے اس کی صحبت میں جانے سے گریز نہ کرنا چاہئے، بلکہ اس کے طرز عمل کی کوئی تاویل کرکے اپنے دل کو سمجھا لینا چاہئے،

۹- استاد جو کچھ رشد و ہدایت کی راہ دکھائے، اس پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۱۰- اگر استاد کسی وقت کوئی باریک علمی نکتہ بیان کرے، اور شاگرد اس سے پہلے سے آگاہ ہو تو بھی اسے پوری توجہ سے سننا چاہئے، اور اس نکتہ کے مرحمت کرنے پر استاد کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۱۱- استاد کے یہاں بغیر اجازت حاصل کئے نہ جانا چاہئے، عام اس سے کہ وہ تنہا ہو یا کوئی دوسرا شخص اس کے پاس بیٹھا ہو، اگر استاد کسی وجہ سے اجازت دینے میں تامل کرے تو اجازت حاصل کرنے پر اصرار نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر یہ شبہ ہو کہ استاد کو اسکی آمد کی اطلاع نہیں ہوئی تو تین مرتبہ سے زیادہ اپنی اطلاع نہ کرائے، اگر اطلاع دینے کے لئے دروازہ پر کھٹکھٹانا ہو تو پہلے آہستہ سے انگلیوں کے ناخن سے کھٹکھٹانا چاہئے، اگر اندر آواز نہ پہونچے، تو انگلیوں سے کھٹکھٹائے، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہتھیلی مارے، اگر اس کے باوجود جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہئے،

۱۲- استاد کی خدمت میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر جانا چاہئے، اور حجامت بڑھی نہ ہو،

۱۳- اگر استاذ کے پاس پہونچکر معلوم ہو کہ وہ کسی کام میں مصروف ہیں تو وہاں پر خاموشی سے کھڑا نہ رہنا چاہئے، بلکہ فوراً لوٹ آنا چاہئے، اگر استاد اس کو روکنا چاہے گا، تو خود ٹھہرائے گا،

۱۴- استاذ سے پڑھنے پڑھانے کے لئے کسی ایسے وقت کا مطالبہ نہ کرنا چاہئے، جو اس پر گراں گذرے،

۱۵- استاذ کے سامنے پورے ادب سے بیٹھنا چاہئے، بیٹھنے میں تواضع انکسار اور خشوع و خضوع ظاہر ہو، اس کی طرف متوجہ رہنا چاہئے، دائیں بائیں بلاضرورت نہ دیکھنا چاہئے، نہ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں جن سے استاذ کی توجہ ہٹ جائے، بعض لوگ بیٹھے بیٹھے اپنے کپڑوں سے کھیلنے لگتے ہیں بعض ناخن چباتے ہیں، بعض اپنے ہاتھ داڑھی پر رکھتے ہیں بعض لوگ داڑھی کے بال ناک میں لیجاتے اور نکالتے ہیں، بعض زمین پر لکیریں بناتے ہیں، یہ اور اس قسم کی تمام عادتیں آداب و تہذیب کے منافی ہیں، ان سے استاذ کے سامنے احتیاط لازم ہے،

۱۶- اسی طرح اوٹھنے بیٹھنے کے جتنے معلوم طریقے ہیں، اون میں جو غیر مہذب اور بے تکلفی کے طریقے ہیں، انھیں استاد کے سامنے اختیار نہ کرنا چاہئے،

۱۷- استاذ کے سامنے بلاضرورت کھانسنا تھوکنا اور ناک صاف کرنا برا ہے، اگر ضرورت پڑے تو مہذب طریقے سے کرنا چاہئے، رومال سے صاف کرنا چاہئے، اسی طرح بے تکلف ہو کر ہنسنا اور مسکرانا بھی ادب کے خلاف ہے، ان تمام عادتوں کے متعلق علماء سلف کے بہت سے اقوال اور واقعات ہیں، جنکا یہاں تذکرہ کرنا طول عمل ہے،

۱۸- استاد کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھنا روا نہیں، نہ اس کے سجادہ اور مصلی پر قدم رکھنا چاہئے، نہ اس کے تکیہ سے ٹیک لگانا چاہئے، البتہ اگر استاد حکم دے اور اصرار کرے تو حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں،

۱۹- استاذ سے ہم کلام ہونے میں تہذیب اور ادب کا لحاظ رکھنا چاہئے، کیوں" میں تسلیم

نہیں کرتا "یہ کہاں ہے"؟ یہ اور اس قسم کے فقرے ادب کے خلاف ہیں، انہی مطلبوں کو مناسب لفظوں میں تہذیب سے ادا کرنا چاہئے،

۲۰- اگر استاد کسی مسئلہ میں ایسی دلیل دیتا ہو اور اس پر اصرار کرتا ہو، جسے شاگرد کا دل قبول نہ کرے، تو بھی اصرار کی صورت میں خوشی سے اسے قبول کر لینا چاہئے،

۲۱- اگر استاد کی شان میں کسی دوسرے نے کوئی نا ملائم بات کہی ہو، تو اسے استاد کے سامنے "نقل کفر کفر نہ باشد" سمجھ کر بلا تکلف دہرانہ دینا چاہئے، بلکہ اس مفہوم کو اشارہ اور کنایہ ہی سے ادا کرنا چاہئے،

۲۲- استاد سے کسی مسئلہ یا سوال وجواب میں ردوکد نہ کرنا چاہئے، اگر وہ کسی بات کے متعلق کہے، کہ "کیا تم نے ایسا نہیں کیا تھا؟" یا "تمہارا یہ مقصد نہ تھا"، تو اس کے جواب میں فوراً تردید کے لئے تیار نہ ہو جانا چاہئے، بلکہ خاموش رہے اور اگر سوال کا جواب باصرار مانگا جائے، تو تہذیب کے ساتھ لطیف انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دے،

۲۳- استاد کے کلام کے سلسلہ کو بیچ سے نہ توڑنا چاہئے، اور نہ اس کی گفتگو کے درمیان اپنی جماعت کے کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنی چاہئے،

۲۴- استاد کے سامنے اپنا ذہن حاضر رکھنا چاہئے، اگر وہ کسی کام کا حکم دے یا کسی بات کے متعلق کچھ دریافت کرے، یا کسی جانب کوئی اشارہ کرے، تو فوراً امتثال امر کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کی طرف دھیان نہ رہے، اور اسے اپنی بات کے دہرانے کی ضرورت پڑے،

۲۵- اگر استاد کوئی چیز طالب علم کی طرف بڑھائے، تو اسے داہنے ہاتھ سے فوراً لینا چاہئے اگر وہ کوئی تحریر ہو تو اسے فوراً پڑھنا چاہئے، اگر استاد اوراق کا کوئی مجموعہ دینا چاہے، اور اس کے

پڑھنے کے وقت اس کے اوراق پریشان ہوگئے ہوں، تو پڑھ کر اسی حالت میں استاد کے ہاتھ سے لے لینا چاہئے، استاد کے ترتیب دینے کا انتظار نہ کرنا چاہئے، بلکہ لیکر خود مرتب کرنا چاہئے، اور اگر وہ کسی کتاب میں کوئی چیز پڑھنے کے لئے بڑھائے، اور وہ کتاب کسی صفحہ پر کھلی ہوئی ہو، تو اسی طرح پر اسی کھلے ہوئے صفحہ کے ساتھ واپس کرنا چاہئے،

۲۶- استاد سے اس قدر قریب نہ ہونا چاہئے، کہ اس کے کپڑوں سے چھو جانے کا اندیشہ ہو اور نہ اس کے سامنے کچھ دیکھنے کے لئے اس قدر جھکنا چاہئے، کہ اس کے پہلو سے مس ہو جانے کا اندیشہ ہو، یہ حرکتیں ادب کے خلاف ہیں،

۲۷- جب استاد مجلس سے اٹھ کر جانے کے لئے تیار ہو، تو اس کی جانماز اٹھا کے، اور اس کے جوتے سیدھے کرنے کے لئے عجلت کے ساتھ بڑھنا چاہئے، بشرطیکہ استاد کو یہ ناگوار نہ گذرے، اور اس فعل سے اللہ کے نزدیک تقرب اور استاد کے دل میں جگہ پانے کی نیت رکھی جائے،

۲۸- اگر استاد کے ساتھ راہ چلنے کا اتفاق ہو، تو ضرورت کے وقت شب میں اس کے آگے چلنا چاہئے، تاکہ اس کے چلنے سے استاد کے لئے راستہ صاف اور چلا ہوا معلوم ہو، اور دن کے وقت اس کے پیچھے چلنا چاہئے، لیکن اگر راستہ میں بھیڑ ہو، تو راستہ بنانے کے لئے آگے چلنا چاہئے، اگر رات کے وقت آگے جانے کا اتفاق ہو تو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے جانا چاہئے، کہ استاد بلا زحمت راستہ طے کر رہا ہے،

اگر استاد راستہ میں کچھ باتیں کرے، تو اس کے داہنے جانب اور بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق بائیں طرف اس سے تھوڑے فاصلہ پر پیچھے رہ کر اس کی باتیں سنے، استاد کے پہلو بہ پہلو صرف ضرورت ہی کے وقت چلنا روا ہو سکتا ہے، یا اس نے خود اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بلا لیا ہو اس صورت میں مونڈھے اور ہاتھوں کو استاد کے جسم سے چھو جانے سے بچائے، اور اگر گرمی کا

زمانہ ہو تو اس طریقہ سے چلنا چاہئے، کہ اس کا سایہ استاد کے جسم پر پڑے، اور اگر جاڑے کے دن ہوں، تو یہ لحاظ رہے کہ دھوپ اس کے جسم پر لگے، اگر استاد راستہ میں کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنے لگے، تو اس قدر پیچھے ہو جانا چاہئے، کہ اس کی باتیں نہ سن سکے، اور اگر قرینہ سے یہ معلوم ہو کہ اس گفتگو میں وہ شریک سمجھا رہا ہے، تو جو پہلو استاد کے مخاطب سے خالی ہو، اس پہلو پر آجانا چاہئے؛

۲۹- اگر استاد راہ میں ملجائے تو اسے عجلت سے سلام کرنا چاہئے لیکن سلام دور سے کرنا مناسب نہیں اسلئے قریب سامنے آکر سلام کرنا چاہئے؛ [۵]

طلبہ میں تعلیم کا شوق اور جد و جہد

اس زمانہ میں طالب علموں میں تعلیم و تحصیل کا بڑا شوق تھا، سید شریف جرجانی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ انھیں شرح مطالع کو اس کے مصنف سے پڑھنے کا شوق ہوا، چنانچہ وہ امام رازی کی خدمت میں پہونچے، مگر وہ ضعیف ہو چکے تھے پڑھانے سے معذور تھے، انھوں نے انھیں سفارشی خط دیکر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ بھیجا، مبارک شاہ نے انھیں حلقۂ درس میں صرف سماع کی اجازت دی مستقل درس اور قرأت کا موقع نہ دیسکے، چنانچہ ان کی تعلیم جاری ہو گئی، ایک مرتبہ رات کے وقت مبارک شاہ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے صحن میں آئے، یہاں ایک طالب علم کو زور کی آواز میں یوں پڑھتے سنا، "مصنف نے یوں کہا، شارح یہ کہتا ہے، اور میں یہ کہتا ہوں،" معلوم ہوا یہ سید شریف جرجانی ہیں، استاد کو طالب علم کی یہ محنت اور شوق طلب پسند آیا، اور دوسرے دن انھیں حلقۂ درس میں سب طالب علموں پر مقدم کر دیا، [۲]

۵ تذکرۃ السامع از ص ۸۰ تا ۱۱۲، اسی قسم کے آداب امام غزالی نے احیاء العلوم جلد ا ص ۳۲ تا ۳۵ میں اور زرنوجی نے تعلیم المتعلم میں اجمال کیساتھ بیان کئے ہیں ۲ الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ ابن خلکان جلد ا ص ۱۶۷، ۱۶۸

شیخ ابو علی ابن سینا کا بیان ہے، کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں کتاب ما بعد الطبیعۃ پڑھنی شروع کی، مگر سمجھ میں نہ آئی، سمجھنے کے لئے اسے بار بار پڑھتے، مگر مفہوم واضح نہ ہوتا، یہانتک کہ چالیس مرتبہ اسے پڑھ ڈالا، اور کتاب ازبر ہو گئی، پھر اتفاق سے ایک دن بازار میں اسی فن کی ایک کتاب ہاتھ آگئی، اسے بھی بادل ناخواستہ خرید لیا، پھر دیکھا تو یہ ابو نصر فارابی کی تصنیف تھی، جس میں اس نے کتاب ما بعد الطبیعہ کے اغراض کی تشریح کی تھی، کتاب پہلے ازبر ہو چکی تھی، اس شرح نے مشکلات کے تمام پردے چاک کر دیئے، [۵]

کتاب الحماسہ کے شارح خطیب تبریزی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ وہ فن لغت میں ابو المنصور کی کسی کتاب کے مطالب حل کرنے کے لئے اپنے شہر کے کسی لغوی کے پاس پہونچے، اس نے کہا کہ ابو العلا معری کی طرف رجوع کرو، چنانچہ وہ تبریز سے معری روانہ ہو گئے، ابو العلا معری سے مل کر اس کے مطالب حل کئے، [۲]

مشہور نحوی و لغوی اسود کے متعلق مشہور ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں چہرے پر تیل مل کر دھوپ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ بدویوں سے ہم شکل ہو جائے، اور ان سے مل جل کر لغت کی تحصیل کر سکے چنانچہ وہ نہ صرف اپنے فن میں امام، بلکہ اسی لقب اسود سے مشہور ہو گیا، [۳]

تعلیمی و علمی حمیت

اس زمانہ کے طالب علموں اور فارغ التحصیل طلبہ میں پوری تعلیمی و علمی حمیت پائی جاتی تھی، ابن جنی نحوی کا نام مشہور ہے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر درس دینے کے لئے بیٹھا، اتفاق سے اس کے حلقہ میں نحو کا مشہور امام ابو علی فارسی پہونچ گیا، اور کسی مسئلہ میں اس نے ابن جنی کی غلطی دیکھی ابو علی صرف اس قدر کہہ کر اٹھ گیا زببت قبل ان تحصرم، تم انگور بننے سے پہلے منقی بن گئے، یعنی ابھی گدرانے

۵ عیون الانباء جلد ۲، ص ۴، ۲ وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۳۳ ۳ نزہۃ الالباء ص ۴۳۷،

بھی نہ پائے تھے، کہ پختہ کار ہوگئے، یہ فقرہ ابن جنی کے دل میں کھپ گیا، اسی وقت دامن جھاڑ کر درس کی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا، اور منزل منزل طے کرکے ابو علی سے جا ملا، اور زندگی بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور پھر خود امام فن کہلایا،[1]

ایک دوسرے نحوی کسائی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک غلط لفظ کسی محفل میں بول گیا، اسے ٹوکا گیا، جس سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اس فن میں کمال حاصل کرنے کا تہیہ کیا، چنانچہ نحو کے استاد خلیل بصری کے حلقہ میں داخل ہوا، یہاں تحصیل کرنے کے بعد اسے خیال ہوا، کہ جیسے خلیل نے اسے حاصل کیا ہے، وہ بھی حاصل کرے، چنانچہ بدوؤں سے ملنے کے لئے بادیہ پیمائی شروع کی، اور کمال حاصل کرکے امام فن کہلایا،[2]

(باقی)

[1] نزہۃ الالباء، ص ۴۰۰ [2] ایضاً،

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

از

مولوی ابو الحسنات صاحب مرحوم

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے درسوں اور تعلیمگاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا، مولوی ابو الحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، جو اہل نظر کو بیحد پسند آیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کیساتھ پیش کیا ہے،

ضخامت ۱۴۴ صفحے قیمت ۱۲ر

"منیجر"

امالی ابی علی القالی

اور

اللآلی

از

مولینا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

(۳)

۳۴۔ ص ۳۱ "کَانَ قطریًا مِنَ النواصِب" یہ سراسر غلط ہے، قطری بن الفجارۃ الخارجی ایک مشہور شجاع و شاعر امیر جیش خوارج تھا، ناصبی خاص حضرت علیؓ کے دشمنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، خارجی حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور سارے بنی امیہ وغیرہ سے عداوت رکھتے ہیں، تارک فرائض اور مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں، اس لئے ان دونوں کے عقائد و خیالات میں بعید فرق ہے،

۳۵۔ ص ۳۲ "العباس بن مرداس شاعر سلمی صحابہ مؤلفۃ القلوب میں سے مشہور شخص ہیں، ان کے نسب میں "ابن ابی عامر بن حارثہ بن عبد بن عبس"، اور کبھی "عبد قیس" کبھی "رفاعۃ بن الحرث بن بھثۃ بن سلیم کبھی الحرث بن یحیٰی بن الحرث، کبھی حیّ بن الحرث" خبط عشوا" اور "نسج خرقا" سے زیادہ نہیں جب اس قدر اشکال تھا، تو سلامتی اجتناب میں تھی، صحیح نسب اسطرح ہے،

"العباس بن مرداس بن ابی عامر ویقال ابن ابی غالب بن جاریۃ بن عبد بن عبس وقیل عبس بن رفاعۃ بن الحرث بن بھثۃ بن سُلیم بن منصور بن عکرمۃ بن خصفۃ بن

قیس عیلان ابن مضر بن نزار بن معد بن عدنان" اب ہم فاضل راجکوٹی کے اغلاط و تصحیفات لکھتے ہیں:-

الف :- حارثہ کی جگہ لکھا ہے، جو جاریہ کی تصحیف ہے، جیسا کہ ابن ماکولا وغیرہ نے ضبط کیا ہے،

ب :- عبد قیس جو اغانی وغیرہ سے منقول ہے، نا قابل اعتبار ہے، صحیح عبد بن عبس یا عنبس ہے!

ج :- "الحرث بن یحیٰی بن الحرث" وغیرہ بھی خبط و غلط، اور محض تعسف ہے، !

۳۶- ص ۳۳ "الریاشی"! اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں،" ابو ریاش القیسی صاحب شرح الحماسۃ" یہ عجیب ادعا، غفلت کا نتیجہ ہے، ابو ریاش القیسی متاخر ہے، ممکن ہے اسے بھی "الریاشی" کہدیں، ورنہ دراصل الریاشی ابو الفضل العباس بن الفرج مشہور رواۃ شعر و اخبار عرب و غریب اور مبرد کا استاد ہے یہی یہاں مراد ہے، نہ اور کوئی،

۳۷- ص ۳۶ حدیث موسیٰ بن محمد بن ابراھیم التیمی عن ابیہ عن جدہ فی صفۃ السحاب کی بابت البکری نے لکھا ہے،" ہو حدیث مسند" معلوم نہیں یہ جملہ کیوں فاضل میمن کی نگاہ تنقید سے چھوٹ گیا، یہ حدیث مسند نہیں بلکہ مرسل ہے، کیونکہ ابراہیم صحابی نہیں، پھر ضعیف بھی ہے کیونکہ موسیٰ متکلم فیہ ہے اور محمد بن ابراہیم میں بھی کلام ہے،

۳۸- ص ۳۸ مرتع بن عمرو غلط ہے، مرتع عمرو کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ مرتع عمرو کا لقب ہے، دیکھو مختلف آمدی، ابن ماکولا وغیرہ،

۳۹- ص ۳۵- وخفاف بن ندبۃ السلمی اتاہ الشعر من قبل خالہ تابط شرا" اس مقام پر لکھتے ہیں، "کذا فی الاصل، ویاتی لہ فی صفحہ ۳۶ انہ خفاف بن نضلۃ وھو الصواب لان ندبۃ امراۃ سوداء"

یہ سارا بیان بوجوہ ذیل صحیح طریق استدلال سے عاری اور غلط در غلط ہے،

الف :- خفاف بن نضلہ اور ابن ندبہ دونوں ایک نہیں ہیں، ابن نضلہ اسدی ہے یہ سلمی،

ب :- خفاف بن ندبہ کے باپ کا نام عمیر ہے، نہ نضلہ، دیکھو انساب عرب، کتاب الاشتقاق مختلف النسبہ وغیرہ،

ج :- ندبہ کے متعلق اختلاف ہے، بعض اسے بنی الحرث بن کعب سے بتاتے ہیں، بعض کسی اور سے مگر اس کا اتصال تابط شرا سے معلوم نہیں ہو سکا،

د :- یہ لکھنا کہ "وھو الصواب لان ندبۃ امراۃ سوداء" عجیب و غریب استدلال ہے، ندبہ کے سودا یا بیضا ہونے سے خفاف بن ندبہ کا خفاف بن نضلہ ہونا کس اعتبار سے صحیح ہو سکتا ہے؟ نہ ماں کے سواد سے عربی صحیح نسب سے نہ ہونا لازم آتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے باپ عمیر کی جگہ نضلہ بنانا ضروری ہے،

ھ :- یہاں اصل مسئلہ پر بھی بحث کی ضرورت تھی، کہ خفاف بن ندبہ کا ماموں کس ذریعہ سے تابط شرا بن سکتا ہے، لیکن ایسی ضروری بحثوں سے میمن صاحب ہمیشہ گریز کیا کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ شارح کا یہ خیال قابل بحث اور صحت سے عاری ہے، اس کی سند ہمیں کتب انساب وغیرہ سے نہیں ملتی، نہ خود شارح نے کوئی ثبوت دیا ہے،

۳۹- ص ۳۹ "درید بن الصمۃ اتاہ الشعر من قبل خالہ عمرو بن معدیکرب" اس پر فاضل میمن نے کشف وغیرہ سے یہ اشکال نقل کیا ہے، "درید غزوہ ہوازن (یعنی حنین) میں قتل ہوا، اس وقت یہ بہت بوڑھا تھا، عمرو بن معدیکرب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لایا، وہ اس وقت توانا تھا" پھر لکھتے ہیں "میرے نزدیک ریحانہ کا جو درید کی ماں ہے، عمرو بن معدیکرب کی بہن ہونا محال ہے، کیونکہ درید قتل کے وقت دو سو برس کے قریب پہونچ چکا تھا، جیسا کہ المعمرین کے نمبر ۲۸ میں مذکور ہے"

اور عمرو ۲۱ھ میں قتل ہوا جب کہ اس کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ تھی، جیسا کہ اصابہ میں ہے، اس سے لازم آتا ہے، کہ بھانجا ماموں سے سو برس بڑا ہو، جو قطعاً حد سے زیادہ عجیب بات ہے"

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ ماموں بھانجے کی عمر میں اس قدر تفاوت ممکن نہیں اسلئے میمن صاحب نے "محال" لکھدیا، مگر اسے محال عقلی شمار کیا جائے، یا عادی ابھی اشکال باقی ہے تھوڑے سے تفاوت کی بنا پر ایسا فیصلہ انھوں نے صادر کر دیا،

اولاً عمر کی تاریخیں حقیقی اور ہر اعتبار سے صحیح نہیں ہوتیں، اسمیں اختلافات کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے اس لئے مناسب تاریخیں معین کرنا ایک محقق مورخ کا اہم فریضہ ہے،

ثانیاً بہن کا بھائی سے بہت بڑا ہونا ممکن ہے، ہو سکتا ہے بہن سب سے پہلی اولاد ہو، اور بھائی سب سے چھوٹی، اس اعتبار سے بھائی بہن میں پچاس ساٹھ سال کا فرق بھی ممکن ہے، اور ایسا دیکھا بھی گیا ہے، ایسی صورت میں تخمیناً سو برس کا تفاوت کوئی محال امر نہیں، اور محض اس ظنی استبعاد سے معاملہ محال تک نہیں پہونچ سکتا،

اس کے بعد ہم اس مضمون کے اہم اغلاط پر متوجہ ہوتے ہیں،

الف: عمرو بن معدی کرب کے اسلام کی بابت یہ لکھنا کہ وہ عمر بن الخطاب کے زمانہ میں تھا، سراسر باطل اور ناقابل التفات ہے، وفد زبید میں عمرو کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ارتداد پھر رجوع الی الاسلام ثابت ہے، ان واقعات کی روشنی میں یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا،

ب: عمرو کے قتل کا واقعہ مختلف فیہ ہے، بعض مورخین کا خیال ہے، کہ نہاوند کے معرکہ میں قتل ہوئے، بعض اس کے فالج یا سانپ کا کاٹنا موت کا سبب بتاتے ہیں،

ج: آغانی میں ہے، کہ ریحانہ عمرو کی ایک بیوی تھی، جسے اس نے طلاق دیکر افسوس کیا تھا،

اس کو میمن صاحب صحیح مان کر ریحانہ اخت عمرو کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اس سے ان کے مدعا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، کیونکہ عمرو کی بیوی کا ریحانہ نام ہونا، اس کی بہن کے ریحانہ ہونے کے نہ خلاف ہے، نہ اس سے اس پر کوئی ایسا اثر پڑ سکتا ہے، کہ درید کی ماں ریحانہ عمرو کی بہن نہ ہو، پس یہ ساری محنت فضول اور عبث ہے، ضرورت اسکی تھی، کہ درید کی ماں ریحانہ کی بابت یہ ثابت کیا جاتا کہ وہ عمرو بن معدی کرب کی بہن نہ تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا، اور معاملہ جوں کا توں رہا،

۴۱- ص ۲۴ "أن الثنی یبین الثنیان، واصلہ من الواو ولکنہ من باب فعل یفعل مثل ولی یلی وجاء المصدر بالواو لیطرد علی فعلہ" شارح کا یہ بیان ہر اعتبار سے مشکل اور غلط ہے، مگر فاضل میمن صاحب اپنی کمال صناعہ کے لحاظ سے ایسے امور پر توجہ کرنا ضروری نہیں خیال فرماتے، اس میں حسب ذیل اغلاط ہیں،

الف: "اصلہ من الواو" یہ غلط ہے، "این" یائی ہے، نہ واوی،

ب: فعل یفعل سے ہونا محض شارح کا بے معنی دعویٰ ہے، اسکی کوئی دلیل اور عرب سے سند نہیں دی،

ج: "المصدر بالواو" غلط اور تحریف ہے، صحیح "بالیاء" ہے تاکہ شارح کا کلام صحیح ہو سکے،

"تاج العروس" جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۳ پر البکری کی یہ عبارت نقل کرکے لکھا ہے، "قال شیخنا رحمہ اللہ قولہ ولی یلی ودعوی کونہ واویاً فیہ نظر ظاہر، ومخالفۃ للقیاس" نیز وہاں "المصدر بالیاء" ہے، جو صحیح طور پر ہونا چاہیے،

۴۲- ص ۴۶ "ورواہ عثمان بن حکیم عن عامر بن سعد عن ابیہ کلھم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، خرجہ عنھم مسلم وغیرہ" اس عبارت پر فاضل میمن صاحب کہتے ہیں، "الروایۃ عن غیر مسلم" شارح نے جب یہ سب روایتیں خاص مسلم سے نقل کی ہیں، تو محشی صاحب

کا فرض تھا کہ اس کو پوری طرح تلاش کرتے، یا سکوت کر جاتے کہ راز درون ظاہر نہ ہوتا، سچ کہا گیا،

وفی الصمت ستر للعیی وانما — صحیفۃ لب المرء ان یتکلما،

کاش وہ صحیح مسلم "باب فضل المدینہ" دیکھتے تو عثمان بن حکیم وغیرہ کی روایتیں موجود پاتے اور جرح لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی،

۴۳۔ ص ۵۱ "وخرجہ محمد بن اسمٰعیل من طریق الاوزاعی بزیادۃ، فقال حدثنا ابومقاتل حدثنا عبد اللہ الخ اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں، "وفیہ کالمغربیۃ ابن مقاتل مصحفاً وفی التقریب ابومقاتل السمرقندی مقبول من الثالثۃ"

یہاں میمنی صاحب نے صحیح بخاری پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، اور اپنے کمال ادبی کو کمال حدیث اور کمال فن رجال سے مخلط کرنے کی بے کار سعی کی،

سبکناہ ونحسبہ لجینا — فابدی الکیر عن خبث الحدید

کاش میمن صاحب اصلی کتاب کو بعینہٖ باقی رکھ کر حاشیہ پر اپنی تحقیق پیش کر دیتے اصل کتاب کو سطح بدل دینا بہت بڑی علمی خیانت ہے، اس میں حسب ذیل اغلاط ہیں،

الف:۔ بخاری کا استاد ابن مقاتل ہے، نہ ابومقاتل!

ب:۔ ابن مقاتل کا نام ابوالحسن محمد بن مقاتل ہے، جو ابن مبارک کے خاص شاگرد ہیں

ج:۔ ابومقاتل سمرقندی بخاری کے رواۃ میں نہیں ہے،!

د:۔ ابومقاتل بخاری کا استاد بھی نہیں ہے،

ہ:۔ ابومقاتل بخاری کے رواۃ کے ہم پلہ بھی نہیں، کیونکہ یہ صرف مقبول ہے، بخاری کے رواۃ کا درجہ اس سے بالاتر ہے،

و:۔ سب سے اہم غلطی اور اصطلاح محدثین سے ناواقفیت کی دلیل یہ ہے، کہ میمن صاحب نے تقریب

سے ابومقاتل سمرقندی کو تلاش کر لیا لیکن اتنا نہ سمجھے، یہ بخاری کا استاد ہے اور یہ نقل کر دیا کہ طبقہ ثالثہ سے ہے، کاش پہلے وہ یہ اصطلاح سمجھ لیتے کہ ثالثہ سے کون ہو سکتا ہے، اور وہ بخاری کا استاد بھی ہو سکتا ہے، "ثالثہ طبقہ صغار تابعین کا ہے، جیسے حسن بصری وغیرہ، ان سے بخاری نے کب روایت کی ہے،

ز:۔ تقریب وغیرہ میں ہر راوی کے متعلق یہ بھی بتا دیا گیا ہے، وہ کس کس کتاب میں ہے، کاش میمن صاحب اس پر نظر ڈال لئے ہوتے، کہ یہ راوی بخاری میں ہے بھی یا نہیں،؟

ح:۔ میمن صاحب نے ادب کی نادر کتابوں کی طرح جن کی روایت منقطع ہو چکی، اور جن کے نسخے شاذ و نادر ملتے ہیں، صحیح بخاری کو بھی نایاب سمجھ لیا، جس کے ایک ایک حرف و نقطہ پر علماء بحث کرتے چلے آئے ہیں، پھر ابن حجر جیسے امام جلیل القدر ماہر فن رجال کی شرح کے ہوتے ہوئے نہ سمجھے کہ یہ ابن مقاتل ہے، یا ابومقاتل،؟ یہ انتہا درجہ کا بے معنی اجتہاد ہے،

اذا رزق الفتی وجہا وقاحا — تقلب فی الامور کما یشاء،

۴۴۔ ص ۲۵ "نقنقت" و "تقنقت" کی بابت اپنی کمال صناعہ سے تحریر فرماتے ہیں، "ولعلہ نقنقت بالنون والتاء، وتقنقۃ بالتائین عن ابی عبیدۃ، فالراجح علی ھذا بالنونین اوبالنونین والتاء، ولعلہ بالتائین ضعیف"

خلاصہ یہ کہ "تقنق" ضعیف، اور "نقنق" قوی، حالانکہ یہ کالعدم ہے، اور ابن الاعرابی وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے، مشہور معاجم میں بھی اس کا وجود نہیں ہے، خود نادر قسم سے ہے، خواہ تقنق بالتاء ہو خواہ "نقنق" بالنون، مگر جسے عجائب سے دلچسپی ہو، وہ ایسے ہی لغات بناتا رہتا ہے، صحیح کو باطل اور ضعیف و باطل کو قوی کر دینا بھی کمال فن ہے،

۴۵۔ ص ۵۰ "سنان بن امیۃ" (امامہ) یہ غلط ہے صحیح امۃ جیسا کہ کتب انساب و لغۃ میں مذکور ہے،

۴۶۔ ص ۰۰، ”محمد بن حفص الوصابی“ اس پر لکھتے ہیں، کذا ھنا ولم اجدہ ولعل الصواب کما سیاتی عمر بن حفص..... الوصابی بالضم منسوب الی ناحیۃ بالیمن“

اس میں دو غلطیاں ہیں، ایک خواہ مخواہ محمد بن حفص کا انکار کرنا، اس کے لئے کافی تتبع وتلاش کی ضرورت ہے، لم اجدہ کہہ کر گذر جانا ہر شخص کی زبان پر زیب نہیں دیتا، یہ صرف وسیع المطالعہ اور وسیع المعرفۃ کا منصب ہے،

مشتبہ النسبہ ذہبی وغیرہ میں یہ موجود ہے اور اسے ”واہ“ لکھا ہے،

دوسری غلطی الوصابی بالضم منسوب الی ناحیۃ بالیمن“ لکھا ہے صحیح الوصّابی بفتح واو وتشدید صاد اس کے جد کی طرف منسوب ہے، دیکھو السمعانی، مشتبہ النسبہ وغیرہ،

۴۷۔ ص ۱۳۱ ”قال ابو عُبیدۃ“ حاشیہ پر لکھا ہے، ھو ابن الجراح کذا کتبتہ اولاً والا فلا ادری الآن من این ھو“ یہ محض فضول ولغو حاشیہ ہے، پہلی غلطی اپنی ذات تک محدود تھی، اب اسے عام کرنے کے لئے شائع کرکے دوسری غلطی کی، اپنی ذات پر اعتماد کس قدر ہوگیا ہے، کہ لچر اور بے معنی بات کو خواہ اسکی کوئی سند نہ ہو، اپنے خیال کے مطابق لکھ دینا کمال صناعہ شمار کرلیا ہے،

یہ ابو عبیدہ کوئی گمنام شخص نہیں، بلکہ امام لغت وادب معمر بن المثنی التیمی ہے، تمام کتب لغت میں اسی سے یہ معنی مذکور ہیں، اور ہر جگہ اس کا ذکر ہے، پس ایسے شخص کو ابو عبیدہ بن الجراح کی طرف گھسیٹ لیجانا بجز میمن جیسے کامل الفن کے اور کوئی نہیں کرسکتا،

۴۸۔ ص ۳۰۹ ”عَنَمَۃ ضبطوہ محرکاً وقال عبدُ الغنی الحافظ فی مؤتلفہ (۹۴) انّہٗ بسکون النون،

اسی مقام پر میمن صاحب نے جدت طرازی میں دو زبردست غلطیاں کی ہیں اگر وہ ذرا تدبر سے کام لیتے تو یہ نوبت نہ آتی،

ایک یہ کہ ”عنمہ“ جسے عبد الغنی نے بالسکون لکھا ہے، وہ عبد اللہ بن عنمہ شاعر کا والد نہیں ہے، جسکی بابت بحث ہے، بلکہ اور کوئی شخص ہے،

دوم یہ ضبط خود عبد الغنی اور ان کی کتاب کی غلطی ہے، کیونکہ العسکری نے کتاب ”تصحیفات المحدثین“ میں ابن ماکولا نے ”الاکمال“ میں، ذہبی نے ”مشتبہ النسبہ“ میں، پھر خاتمۃ الحفاظ علامہ ابن حجر العسقلانی نے ”تبصیر المنتبہ“ میں بجز مفتوح النون کے اور کچھ لکھا ہی نہیں ہے، اگر عبد الغنی کے یہاں غلطی تھی، تو اسے ظاہر کرنا چاہئے تھا، ورنہ دونوں صورتوں کے متعلق کچھ لکھتے، پس یہ ضبط باطل اور ناقابل اعتبار ہے، نسخہ کی غلطی کا قرینہ غالب ہے، ورنہ نسخہ اگر صحیح ہو جائے، تو خود حافظ عبد الغنی کی غلطی ماننی پڑے گی، کیونکہ تمام ائمہ لغت ونسب کے خلاف ان کا ضبط کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہوسکتا،

۴۹۔ ج ۲ ص ۹۱۷۔ ”وکان وراء القوم منھم بقیۃ“ الخ یہ نابغہ جعدی کے مشہور قصیدہ کا ٹکڑا ہے اسکی تخریج نہ معلوم کیوں چھوڑ دی،

۵۰۔ ص ۹۲۲۔

هَل تَخمِشَنْ ابلی علی وُجُوهها،   اوتَعطِبَنَّ نحورَھا بالآلی،

اس شعر میں الآلی کا لفظ میمن صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا، اس واسطے مصحف لکھ کر استفہام کی علامت آگے لکھدی، صحیح لفظ ”بمآلی“ ہے، مآلی جمع مِئلاۃ بالکسر وہ سیاہ کپڑا جسے ماتم کرنے والی عورتیں استعمال کرتی ہیں، دیکھو الشعر والشعراء ابن قتیبہ طبع جدید مصر ص ۹۰ وغیرہ،

تنبیہ:۔ بعض ائمہ لغت نے مئلاۃ کا لمعلاۃ لکھا ہے، اس سے محض وزن مقصود ہے، حرکت میم نہیں وہ بالکسر ہی ہے،

۵۱۔ ص ۹۲۵ ”ولہ اجدہ بمعنی تشریح الشعر من باب التفعیل“

معلوم نہیں میمن صاحب نے لغت کی کتنی کتابیں یاد کرلی ہیں یا کتنے لغات پر انھیں احاطہ ہے کہ

وہ ایسے بے معنی دعوی کی جرأت کرتے ہیں، اکم از کم صحاح، جمہرۃ، لسان، قاموس وغیرہ پر عبور حاصل ہونے کے بعد اس قسم کے جملے لکھنے کی جرأت کرنی چاہئے،

لیجئے، ہم صرف جمہرہ سے اسکی متعدد شہادتیں پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق صناعت کے ماہر علم "حذق" لکھ کر اپنا کمال ثابت کر رہے ہیں،

ج ۲ ص ۲۴۴ پر لکھتے ہیں، "دریت الشعر بالمدری تدریۃ، قال الشاعر،

قد علمت اخت بنی فزارۃ   ان لا ادری لمتی لجارۃ

ج ۱ ص ۱۲ پر ہے:-

وام مثواہ تدری لمتی   وتغمز القنفاء ذات الفروۃ

اسی صفحہ پر تیسرا شعر ملاحظہ ہو،

وقد اشہد الخیل المغیرۃ بالضحی   وانت تدری فی البیوت وتفرق

یہ صرف لغت کی ایک کتاب کے حوالے ہیں، بھلا ایسی ناقص تلاش پر لم اجد کہنا کیونکر اہل علم کے نزدیک پسندیدہ ہو سکتا ہے، پھر اس کی وجہ سے "یدرین" کو "ویدرین" بنانا قبل از وقت نہیں تو اور کیا ہے؟

تدقمت الظبا علی خواشٍ   فمایدری خواشٍ مایصیدُ

۵۲ - ص ۹۰۹ "مضریۃ ملحۃ وقال ابو عمرو بن العلاء، قال زہیر حرب مضرۃ ولو کان الی لقلت مضرۃ ای تعترم وتمضی"

اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں:-

کذا وانظر کیف یزن البیت علیہ؟ وعلی اصلاح ابی عمرو، ولکنی اری ان لاحاجۃ الی مضرۃ، ولا الی مضرّۃ، فانھم ینسبون کل ما فیہ شدۃ الی مضر"

یہ تمام بحث عجیب و غریب اور لطیف تحقیق کا نمونہ ہے، کاش یہ حاشیہ وہ نہ لکھتے، تو اتنے اغلاط کا بار اپنے سر پر نہ لادتے،

وہ اصل مضمون ہی نہ سمجھے، ورنہ وزن کے جھگڑے سے نجات مل جاتی، اغلاط بغور ملاحظہ فرمایئے،

الف:- شرح "مضریۃ" کی نہیں "مضرۃ" کی ہے، جو زہیر کے پہلے بیت کے پہلے مصرع میں ہے حرب عوان مضرۃ، یہاں مضریہ کا کوئی موقع نہیں، اسی کو ابو عمرو "مضرۃ بالضاد المثلثۃ" کہنا چاہتے ہیں، غریب مطالب کی طرف جانا، اور واضح اور مانوس کو ترک کرنا "غریب" کی نسبت صحیح کرنے کے واسطے ضروری ہے ان الغریب لیسعد الغرباء،

ب:- زہیر نے حرب مضریہ کب کہا ہے، جس کے واسطے میمن صاحب لکھتے ہیں "مضرۃ اور مضرّہ کی ضرورت نہیں، مضریہ بھی درست ہے،

ج:- میمن صاحب کا یہ کہنا کہ "ہر ایک شدت کی چیز مضر کی طرف منسوب ہوتی ہے،" ان کا تخیل محض اور کلام عرب پر ادعاء ہے، ورنہ اس کا ثبوت پیش کریں، زہیر نے اگلے بیت میں "قضاعیۃ" اور "مضریۃ" دونوں کہا ہے، تو کیا قضاعہ کی طرف بھی شدت کی نسبت ہوا کرتی ہے،

۵۳:- تنبیہ (۱) میمن صاحب کی اس کتاب میں جا بجا "ابن" کے پہلے خواہ وہ علمین کے درمیان کیوں نہ ہو، الف لکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ائمۂ فن کے نزدیک غلط ہے، مثلاً اس جگہ "ابو عمرو ابن العلاء" نہ معلوم یہ کون جدید اجتہاد میمن صاحب نے اس بارہ میں کیا ہے،!

۵۴ - تنبیہ (۲) امالی کے جز ثانی ص ۲۵۸ پر "ما افترقت فرقتان بعد مدرکۃ" ہے، حالانکہ صحیح "طابخۃ" ہے، جیسا کہ سلسلۂ نسب اور تمام قصہ سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح یہ قصہ کتب انساب و لغت میں آیا ہے،

۵۵ - اسی طرح اس صفحہ پر "المامور" نام آیا ہے، جس پر محشی نے لکھا ہے، "کن ابا الاصلع بمیمین

بوزن مفعول، اس قسم کے اشکال پر میمن صاحب کی وسیع نظر نہیں کام کرسکی، وہ تو تفحص و طلب اشیار کا تتبع کیا کرتے ہیں، اور خوب محنت کرکے خود بھی تھکتے ہیں، اور دوسروں کو بھی تھکانے کی فکر میں رہتے ہیں،!

یلجلج مُضغۃً فیہا انیضُ اصَلّت فہی تحت الکشح داءٌ

المامور غلط ہے، صحیح المامومُ بالمیم اخیر ابدل الراء جیسا کہ ابن درید نے کتاب الاشتقاق میں ضبط کیا ہے، شیبان کا بیٹا ماموم تھا، نہ مامور، اسی کا بیٹا غنجل بن الماموم "یوم وقیط" میں قید ہوا تھا، جس کا مسئلہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں،

لطیفہ و خاتمہ، میمن صاحب نے اس غریب کتاب کو خواہ مخواہ اپنا مہمان بنا لیا تھا، وہ بھی ایک دو وقت کے لئے نہیں، سات آٹھ سال کے لئے آپ کی مہمان نوازی کا لنار علی علم معروف و معلوم ہے اسی بنا پر تحریر فرماتے ہیں، "ولکنتی بعد کیت وذیت ولو ولیت احمد المولیٰ سبحانہ علی انتہ غادر البیت، وان کان غادر لی ایضاً اللقیٰ کالمیت" بڑے اخلاص و عجز سے میمن صاحب اللہ تعالے کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آخر بہت سے مشکلات کے بعد یہ مہمان جو بمنزلہ شیطان جم گیا تھا، روانہ ہوگیا، اس فقرہ سے ہمارے دوست کی مہمان نوازی کی شان ظاہر ہوتی ہے، جو بے اختیار واقعہ بن کر ان کی زبان قلم پر آگیا اور ہم سب احباب نے ان کے اس فقرے سے بڑا مزہ لیا،

ابو العلاء و ما الیہ،

عربی زبان میں خیام عرب ابو العلاء کے حالات سوانح اور اس کے مساعی پر بہترین تبصرہ،

حجم ۲۷۰ صفحے قیمت مجلد ہے رغیر مجلد عار مطبوعہ مصر،

"منیجر"

سلاطین غزنہ کے ہندوستانی حکام

از

مولینا سید ابو ظفر صاحب ندوی،

ہندوستانی زبان میں عام طور پر جو تاریخیں ہندوستان کی لکھی گئی ہیں، خصوصاً اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لئے، ان کو پڑھ کر نہ صرف عام تعلیمیافتہ اشخاص بلکہ بلند طبقے کے سنجیدہ اور فہمیدہ لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی شہاب الدین محمد غوری ہے حالانکہ اس سے صدیوں پہلے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی،

سچ پوچھو تو اسلامی سلطنت کا اصلی بانی محمد بن قاسم ثقفی ہے، جس نے پہلی صدی کے آخر میں بحر عرب سے لیکر کشمیر تک فتح کرکے اسلامی سلطنت کا سکہ بٹھایا، لیکن اس زمانہ میں ہندوستان تین حصوں میں منقسم تھا، سندھ، ہند اور دکن،

محمد بن قاسم نے جو ملک فتح کیا، اس زمانہ میں اسکو سندھ کہتے تھے، اور اسی لئے عام لوگ محمد ابن قاسم کو فاتح ہندوستان نہیں، بلکہ فاتح سندھ جانتے ہیں،

مہلب بن ابی صفرہ (۴۴ھ) کے بعد صحیح معنی میں سب سے پہلا حملہ ہندوستان پر سبکتگین کا تھا جس نے ۳۸۰ھ کی جنگ میں لمغان سے لیکر پشاور تک فتح کرکے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی، حد کی حفاظت اور مفتوحہ علاقہ کے انتظام کے لئے ایک مسلمان ترک اس نے مقرر کیا، یہ سرحدی ہندوستان کا پہلا مسلمان حاکم ہے،

سلطان محمود غزنوی ماہ صفر ۳۸۸ھ میں جب تخت نشین ہوا، تو سب سے پہلے سلطنت بخارا سے اسکی جنگ ہوئی، اسی میں کچھ دنوں الجھا رہا، اس لئے ہندوستان کی طرف رُخ نہ کر سکا، ۳۹۰ھ اور ۳۹۱ھ میں جے پال سے سرحدی جنگیں ہوئیں، انمیں سلطان محمود کامیاب رہا، لیکن سندھ کے اس پار کوئی ملک ہاتھ نہ آیا، ۳۹۵ھ میں بھاٹیہ (بھیرہ) فتح ہوا، اور ۳۹۶ھ میں ملتان کی ریاست باجگذار ہو گئی، ان جدید مقبوضات کے لئے جو دریائے سندھ کے اس پار تھے، ایک حاکم کی ضرورت محسوس ہوئی، سلطان محمود نے نہایت فراخدلی سے سکھ پال نامی ایک ہندوستانی کو جو کسی راجہ کا نواسہ تھا، یہاں کا حاکم بنایا،[1] یہ جدید مفتوحہ علاقہ میانوالی سے لیکر دریائے سندھ کے کنارے ملتان تک تھا، جس کی حکومت سکھپال کے سپرد کی گئی، سلطان محمود غزنوی کا یہ پہلا تجربہ تھا، کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کے ذریعہ حکومت کیجائے، مگر افسوس یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوا، سکھ پال نے جب دیکھا کہ سلطان ہندوستان سے دور ترکوں سے جنگ میں مشغول ہے، تو اس نے باغی ہو کر خود مختاری کا اعلان کر دیا، سلطان کو اس بغاوت کی خبر اس وقت ہوئی، جب ۳۹۷ھ میں ترکوں پر فتح پا کر غزنہ واپس آرہا تھا، چنانچہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ایک ترکی افسر کو ہندوستان بھیجدیا، جس نے سکھپال کو گرفتار کر کے ایک لاکھ تاوان وصول کیا، اور غالباً اس کے بجائے کوئی دوسرا ترک حاکم مقرر ہوا،

۴۰۵ھ میں سلطان محمود نے قلعہ نندنہ پر حملہ کیا، جو کوہ بالاناتھ پر راولپنڈی کے پاس کوہ نمک میں واقع تھا، یہاں کا حاکم بھاگ کر درۂ کشمیر میں چلا گیا، اور اس کا ماتحت افسر جنگ میں ناکامیاب ہوا اور مجبوراً قلعہ سلطان کے سپرد کر دیا، سلطان نے پورے علاقہ پر قبضہ کر کے اپنے ایک ترک افسر سارغ نامی کو یہاں کا حاکم بنایا، جو اپنے حسن انتظام کے سبب سے سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ تک اپنے عہدہ پر برقرار رہا،[2]

---

[1] زین الاخبار ص۶۹ لندن ۵۲ء صفحہ ۶۲ مطبوعہ لندن،

۴۰۷ھ میں سلطان محمود نے اپنے لڑکے مسعود کو ملتان بھیجا، یہ مشہور پایہ تخت تھا، اور خارجی اُمُور سیاسی اعتبار سے بھی یہاں کسی حاکم کا رہنا ضروری تھا، تاکہ ایک طرف غیر مسلموں پر نگاہ رہے اور دوسری طرف اسماعیلیوں کی سرگرمی کا خاتمہ کر دیا جائے، جو پایہ تخت میں انقلاب کی سازش کر رہے تھے، اسکے علاوہ سلطان محمود اپنے لڑکے مسعود سے ناراض بھی تھا، اسلئے پایۂ تخت سے دور بھیجکر ایک قسم کی تنبیہ بھی مقصود تھی، اسلئے ۴۰۸ھ میں ہرات کی حکومت اس کے سپرد ہوئی،

اس کے بعد سلطان نے اختیارات کے دو حصے کر دیئے، دیوانی تو قاضی شیرازی کے سپرد کئے، فوجداری اور سپہ سالاری کے عہدہ پر سپہ سالار حاجب علی اریارق ایک ترک افسر کو مقرر کیا، اس نے عرصہ تک یہاں حکومت کی، اس لئے اس کے دشمن بہت ہو گئے، چنانچہ جب اسکی متعدد شکایتیں سلطانی دربار میں کی گئیں، تو سلطان بھی اس سے متاثر ہوا، اس نے اس کو غزنہ کے دربار میں طلب کیا، مگر وہ نہ گیا، سلطان محمود کا یہ آخری وقت تھا، اس لئے موقع نہ ملا کہ اس کی نافرمانی کی سزا دیتا، سلطان محمود کے انتقال کے بعد جب سلطان محمد تخت نشین ہوا تو اس نے بھی دربار میں حاضر ہونے کا فرمان بھیجا، مگر حاجب علی یہ کہکر ٹالتا رہا کہ سلطان مسعود اگر عراق سے حرکت نہ کرے گا، اور آپ مستقل بادشاہ تسلیم کر لئے جائینگے تو اسوقت میں غزنہ حاضر ہو جاؤں گا،[1]

سلطان محمود کا وزیر احمد بن حسن میمندی جو قلعہ کالنجر میں قید تھا، اسکو سپہ سالار مذکور کی یہ خبریں ملتی رہیں، وہ تجربہ کار وزیر تھا، سمجھ گیا کہ اگر اسکو ذرا بھی ڈھیل دی گئی، تو وہ بہت جلد خود مختاری کا اعلان کر دے گا، اس لئے جب وہ قید سے نجات پا کر سلطان مسعود کے پاس جانے لگا، تو اس نے سپہ سالار اریارق سے کہا کہ تم نے بار بار نافرمانی کی ہے، اس لئے اب بہتر یہ ہے، کہ تم میرے ساتھ چلو تاکہ تمہارے متعلق بادشاہ سے گفتگو کر کے تمکو خلعت اور فرمان دلاؤں، اسکے بعد تم عزت کیساتھ ہندوستان واپس آجاؤ،

---

[1] بیہقی ص۲۶۶، کلکتہ،

وزیر کی چرب زبانی سے سپہ سالار متاثر ہوکر غزنہ چلاگیا، سلطان اسوقت بلخ میں تھا، وزیر نے دربار سلطانی میں حاضر ہوکر اصل حقیقت سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ فوراً دربار میں طلب کیا گیا، ابتدا میں اسکی بڑی عزت کی گئی، مگر جب وہ نشہ میں برسر دربار امراء کو گالیاں دینے لگا، تو چہار شنبہ ۱۹ ربیع الاول ۴۲۲ھ میں بادشاہ نے اس کو نظر بند کردیا،[۱]

غالباً دوسرے حاکم کے لاہور پہنچنے تک عبداللہ قراتگین قائمقام سپہ سالار لاہور قاضی شیراز کیسا تھ ملکر کام کرتا رہا،[۲]

چھ سات ماہ کے بعد شعبان ۴۲۲ھ میں احمد نیالتگین ہندوستان کا سپہ سالار ہوکر آیا لیکن بدقسمتی سے وزیر احمد بن حسن میمندی اس سے سخت ناراض تھا، اور قاضی شیرازی کا دل بھی اس سے صاف نہ تھا، اس لئے وزیر نے ان دونوں کو لڑا دیا، چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد دونوں میں کشمکش شروع ہوگئی، انجام کار دونوں میں سخت عداوت ہوگئی، دونوں نے دربار سلطانی میں شکایتیں لکھیں، لیکن قاضی صاحب کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی، اسلئے وہ تو خاموش ہوگئے، مگر احمد نے یہ حرکت کی کہ خراج کی وصولی بھی خود ہی شروع کردی اور اس طرح راجوں اور ٹھاکروں سے وصول کرکے کافی روپیہ جمع کرلیا،

اب اس نے ہندوستانی، ترکی اور دیلمی لوگوں کو فوج میں بھرتی کرکے ایک زبردست لشکر تیار کرلیا، اس فوج کو لیکر گنگا کے میدان میں جا پہونچا، پھر اسکو عبور کرکے جب آگے بڑھا، تو بائیں طرف اس کو ایک شہر نظر آیا، جس کا نام "نبارس" تھا، یہ بہت بڑا شہر دو فرسخ (چھ میل) چوڑا، اور دو ہی فرسخ لمبا تھا، اور لب گنگا ہونے کے باعث پانی کی کوئی کمی نہ تھی،

لشکر نے جب اس شہر پر حملہ کیا، تو صبح کا وقت تھا، اس وقت سے عصر تک اسکو لوٹتا رہا،

۱؎ بیہقی صفحہ ۴۲۴ و صفحہ ۴۲۵، کلکتہ ۲؎ بیہقی صفحہ ۴۹۶،

مگر اس پر بھی بزازوں، عطر فروشوں اور گوہر فروشوں کے بازار سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ غنیم اس عرصہ میں تیار ہوگیا تھا، فوج نے سونا چاندی، جواہرات اور عطریات لوٹ کر بڑا ذخیرہ حاصل کیا، لوٹ کے مال میں چند ہاتھی بھی تھے،[۱]

احمد جب لاہور واپس ہوا تو لوٹ کا پانچواں حصہ اور دوسری نادر چیزیں دربار سلطانی میں روانہ کیں، قاضی صاحب کو اس پر بڑا حسد ہوا، انھوں نے ایک عریضہ خفیہ طور پر بادشاہ کے پاس روانہ کیا جسمیں تحریر تھا کہ احمد نے لوٹ کا مال بہت حاصل کیا ہے، اس میں سے اعلیٰ درجہ کا مال اور بیش قیمت چیزیں چھپالی ہیں، مال کی اصلی فہرست جاسوسوں کے ذریعہ جو حاصل ہوئی ہے، وہ ملاحظہ کے لئے ارسال خدمت ہے،

سلطان پر اس خفیہ تحریر کا بڑا اثر پڑا، خصوصاً ترکمانوں کی فوجی بھرتی سے بہت خوفزدہ ہوا کیونکہ وہ اسوقت تک ۷۰ غلام خرید چکا تھا، اس نے سمجھا کہ غالباً وہ خود مختاری کا خواب دیکھ رہا ہے،

بادشاہ نے مناسب سمجھ کر ایک ہندو افسر ناتھ بن ہلی کے ماتحت تنبیہ کے لئے ایک فوج روانہ کردی، لیکن افسوس کہ اس فوج کو شکست ہوئی اور ناتھ مارا گیا، احمد اب پہلے کے بہ نسبت زیادہ طاقتور ہوگیا تھا، اس کا مقابلہ اب آسان نہ تھا، اسلئے بادشاہ نے مجلس مشاورت میں یہ طے کیا کہ ایک جدید طاقتور فوج اسکے مقابلہ کو روانہ کیجائے، لیکن اس فوج کی سرداری کون لے، اس کے لئے کوئی تیار نہ تھا، آخر ایک ہندو افسر تلک بن جھیلن نے اس کو قبول کرلیا، اور ایک بڑی فوج لیکر منگل کے دن ۱۵ ر جمادی الاول ۴۲۵ھ کو لاہور روانہ ہوگیا،[۲]

ہندوستان پہونچکر اس نے احمد کا مقابلہ کیا، مگر شکست ہوئی، پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوا، اس نے بڑی تیزی سے فوجی بھرتی شروع کردی، اسوقت شمالی ہندوستان میں دو قومیں زیادہ جنگجو تھیں، ایک گوجر راجپوت دوسرے سندھ کے جاٹ، بیہقی نے جنگ سیستان کے موقع پر ان ہندو سپاہیوں کی مجنونانہ بہادری کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے، کہ غالباً راجپوتوں کی تعداد

۱؎ کامل ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۱۴۵، مصر، ۲؎ زین الاخبار صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ لندن،

فوج میں بہت زیادہ تھی، اور درحقیقت تمام شمالی ہند میں بھی ایک قوم ایسی بہادر تھی، جو ترکوں کا مقابلہ کرلیتی تھی،

تلک نے جنگی تیاری جب کافی طور پر کرلی تو دوسری تدبیر یہ کی کہ خفیہ طور پر احمد کے لشکر میں پھوٹ ڈالدی، اور اس طرح اس کی فوج کے دو حصے ہوگئے، تاہم وہ ایک ترک تھا، شجاعت اس کے رگ و پے میں پیوست تھی، اس نے نہایت استقلال سے میدان کارزار میں جنگ آزمائی کی، لیکن آخر میں شکست کھاکر سندھ کی طرف چلا گیا،[1]

شکست دینے کے بعد تلک نے سب سے پہلے لاہور کے قلعہ پر قبضہ کرلیا، اور احمد کے ساتھی جس قدر وہاں تھے، سب کے داہنے ہاتھ کاٹ ڈالے، اس سخت سزا سے لوگوں کو بڑی عبرت ہوئی، احمد کے ہمراہی پناہ مانگ مانگ کر جدا ہونے لگے،

اب تلک نے احمد کا تعاقب کا شروع کیا، جہاں مڈبھیڑ ہوجاتی، ایک سخت جنگ کی شکل اختیار کرلیتی، تلک نے اسی کیساتھ احمد کے سپاہیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکمانوں کی پوری فوج احمد سے علیحدہ ہوکر تلک کے پاس پناہ گزین ہوگئی اور اسکے پاس صرف تین سو آدمی رہ گئے،

تلک نے جب دیکھا کہ اب بھی احمد ہاتھ نہیں آتا، تو اس نے تمام ٹھاکروں کے یہاں خطوط لکھے کہ جو شخص احمد کو پناہ دیگا، وہ شاہی مجرم قرار دیا جائے گا، اور اس کے گرفتار کرنے والے کو پانچ لاکھ درہم (ایک لاکھ روپیہ) انعام ملیگا، اس انعام نے احمد کے دشمنوں میں بڑی تعداد کا اضافہ کردیا، اب سندھ کا ہر جٹ کاشتکار، اس کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا،

غالباً احمد بلوچستان یا سیستان چلا جانا چاہتا تھا، لیکن عین اس موقع پر جب کہ دریائے سندھ کے

۱؎ بیہقی صفحہ ۵۳۰ کلکتہ،

پاس تھا، دو تین ہزار سوار اور پیادہ سندھی جٹ آپہنچے، احمد کے پاس دو سو سواروں سے بھی کم تھے، اسلئے دریا پار ہوکر نکل جانا چاہا، لیکن سندھی جٹ بھی دوڑ پڑے، اور اسکو چاروں طرف سے گھیر کر مار ڈالا، اور اسکے لڑکے کو گرفتار کرلیا، بقیہ کچھ قتل ہوئے، کچھ ڈوبے، جو بچے وہ قید کرلئے گئے، تلک بھی قریب ہی تھا، جلد آپہنچا، اور اس خوشخبری سے بہت ہی مسرور ہوا،

اب جٹوں نے پانچ لاکھ درہم کا تقاضا شروع کیا، تلک نے کہا کہ احمد کا تمام مال تم نے لوٹ لیا، کیا یہ تمھارے لئے کافی نہیں ہے؟ اس کے علاوہ تم نے شاہی خدمات انجام دینے یہ تمھارا فرض تھا، آیندہ تمھارا خیال رکھا جائے گا،

لیکن اس چرب زبانی سے جٹوں کا سردار ذرا متاثر نہیں ہوا، اس نے بغیر رقم لئے احمد کا سر اور اس کے لڑکے کو حوالہ کرنے سے صاف انکار کردیا، آخر گفت و شنید کے بعد ایک لاکھ درہم (۲۵ ہزار روپے) پر معاملہ طے ہوگیا، تلک فتحیاب ہوکر لاہور واپس آیا، اور انتظام مملکت میں مصروف ہوگیا، ذوالحجہ ۴۲۶ھ میں تلک اپنے قائم مقام (نائب) کو چھوڑ کر غزنہ واپس چلا گیا،[1]

شنبہ ۳ ر ذوالقعدہ ۴۲۷ھ میں سلطان مسعود نے اپنے لڑکے امیر مجدود کو ہندوستان کا والی (حاکم اعلیٰ) بناکر لاہور بھیجا، چلتے وقت بہت ہی بیش قیمت خلعت جیسا کہ والیان ملک کو دینے کا دستور تھا عنایت کیا اور اسی کیساتھ امارت کی نشانی طبل، علم، اور ہاتھی مع ہودج بھی سرفراز فرمایا، لشکر کیساتھ تین تجربہ کار مشیر بھی تھے، جن میں سے ابو منصور بن ابو القاسم علی نوکی کو برادر سعد سلمان کو مستوفی (محاسب) کا عہدہ عنایت فرمایا، امور فوجی کام محمد کے سپرد ہوا، سلطان محمود کے مشہور غلام ابو النجم ایاز بن ایماق کو امیر مجدود کا اتالیق بناکر ساتھ کردیا،[2] اور خوارزم شاہ (خیوہ) کے لڑکے رشید نامی کو بھی اسکے سپرد کردیا، کہ ہندوستان پہونچکر لاہور کے قلعہ میں اس کو نظر بند رکھے،[3]

۱؎ بیہقی صفحہ ۵۲۶ کلکتہ، ۲؎ فرشتہ جلد اول صفحہ ۷۳ ۳؎ بیہقی صفحہ ۶۲۲ کلکتہ،

سنہ ۴۳۲ھ میں امیر محمد بن محمود غزنوی نے اپنے لڑکے نامی بن محمد بن محمود کو ملتان اور منصورہ (سندھ) کا حاکم بنایا، لیکن امیر محمد کے قتل ہونے پر امیر مودود نے ایک امیر ابو نصر محمد بن احمد کو لشکر دیکر سندھ روانہ کیا، اس نے شاہزادہ نامی بن محمد کو قتل کر کے سندھ اور ملتان پر قبضہ کر لیا،

شاہزادہ مجدود بن مسعود کو جب معلوم ہوا، کہ بڑا بھائی مودود بن مسعود، غزنہ کا سلطان ہو گیا، تو اس کے دل میں بھی سلطنت کی ہوس پیدا ہوئی، وہ ہر طرف سے دولت جمع کرنے لگ گیا، اور ایک زبردست فوج کے ساتھ مقابلہ کا اس نے پورا بندوبست کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اتالیق امیر ایاز کے ذریعہ سندھ سے لیکر ہانسی اور تھانیسر تک کا بہترین انتظام کیا، اس کا خیال تھا، کہ دہلی بھی فتح کرلے، اور اسی لئے وہ ہانسی میں مقیم تھا، لیکن سلطان مودود کو اسکی نیت کا پتہ چل گیا، اس نے ایک لشکر مدافعت کے لئے روانہ کیا، ادھر مجدود بھی غزنوی لشکر کے پہونچنے سے پہلے قلعہ لاہور میں داخل ہو گیا،

اس عرصہ میں غزنوی لشکر بھی لاہور پہونچ گیا، مگر ان میں سے اکثر امیر مجدود سے مل گئے، قریب تھا کہ غزنوی فوج شکست کھا جائے، کہ ۱۳ ذوالحجہ سنہ ۴۳۲ھ میں امیر مجدود والی ہندوستان صبح کے وقت اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کا اتالیق ایاز بھی لاہور میں مرگیا، اور وہیں دفن ہوا[1] (اسکی قبر آج تک لاہور میں مشہور ہے)

امیر مجدود اور غلام ایاز کس طرح مارے گئے، اس کا صحیح حال کسی کو معلوم نہیں، ہوا مگر یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی موت خفیہ طور پر زہر سے ہوئی، ان کی موت نے راستہ صاف کر دیا، اور اب ہندوستان بلا شرکت غیرے سلطان مودود بن مسعود کے قبضہ میں آگیا،

لیکن خاندان غزنویہ میں اس خانہ جنگی سے بڑا ضعف پیدا ہو گیا تھا، اس کو ہندوستانیوں نے

[1] الکامل جلد نہم صفحہ ۱۸۱ و فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۶ بمبئی،

محسوس کیا، چنانچہ سنہ ۴۳۵ھ میں راجہ دہلی نے دو اور راجوں کی مدد سے تھانیسر اور ہانسی پر حملہ کر کے فتح کر لیا، اور یہ دونوں ضلعے سلطان کے قبضہ سے نکل گئے، اس فتح یابی سے ان کی ہمت بڑھ گئی، اور آگے بڑھکر قلعہ بھیم نگر پر حملہ آور ہوئے، قلعہ کے ترک سپاہی جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ دشوار ہے، پھر بھی وہ قلعہ بند ہو کر لڑنے لگے، اور لاہور کے حاکم کو اطلاع دیکر مدد کی درخواست کی، لیکن افسوس کہ ان کو کسی قسم کی مدد نہ ملی، ان مٹھی بھر بہادر ترکوں نے ہندوستانیوں کا چار مہینہ تک مقابلہ کیا، جب لاہور کی مدد سے مایوس ہو گئے، اور سامان رسد ختم ہو گیا، تو غنیم سے امان طلب کر کے قلعہ اس کے سپرد کیا اور خود لاہور چلے آئے،

پنجاب اور اس کے ارد گرد کے حکمرانوں نے جب غزنوی سلطنت کا یہ حال دیکھا، کہ ایک طرف ان کے دشمن فتحیاب ہو رہے ہیں اور دوسری طرف غزنہ کے ترک حاکم خانہ جنگی میں مبتلا ہیں اور کوئی ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتا، تو ان کو بھی طمع دامنگیر ہوئی، اور چاہا کہ لاہور پر قبضہ کرلیں، چنانچہ تین حاکموں نے مل کر دس ہزار سوار اور بے شمار پیادوں کیساتھ لاہور کا محاصرہ کر لیا، اب ترکوں کی آنکھ کھلی، غفلت اور خانہ جنگی کا نتیجہ سامنے نظر آرہا تھا اس لئے فوراً غزنہ خبر بھیجکر سلطان سے امداد کے طالب ہوئے، ادھر ہندوستان میں جتنے ترک تھے، وہ اپنی خانہ جنگی کو بالائے طاق رکھکر متحد ہو گئے،

اس اتحاد کا بڑا خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا، ترکوں نے ایک طرف سے جم کر مقابلہ شروع کر دیا اور دوسری طرف سے جنگی تدبیریں اور جوڑ توڑ سے کام لیا، چنانچہ قبل اس کے کہ غزنہ سے امدادی فوج آئے ان راجوں میں سے ایک نے اطاعت قبول کر لی، یہ دیکھ کر بقیہ دو گھبرا کر بھاگ نکلے، قلعہ کے ترکوں نے جو ان کو فرار ہوتے دیکھا تو ان کا تعاقب شروع کیا، چنانچہ پہلے ایک راجہ کو جس کا نام دیپال ہری ناتھ تھا، جا لیا، دونوں میں سخت جنگ ہوئی، آخر راجہ شکست کھا کر بھاگا، اور

اپنے تمام لشکر کے ساتھ پہاڑی قلعہ مین جاکر پناہ لی، اس وقت اسکے پاس پانچہزار سوار اور ستر ہزار پیادے تھے، ترکوں نے بھی قلعہ کا محاصرہ کرلیا،

راجہ کو اس قلعہ میں خلاف توقع پناہ لینی پڑی، اور غالباً قلعہ میں اسقدر سامان رسد نہ تھا، کہ پون لاکھ سپاہیوں کو کافی ہو، اسلئے انھوں نے متعدد حملوں سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے، یہان تک کہ راجہ نے پریشان ہوکر صلح کی درخواست کی اور قلعہ حوالہ کر دینے کا اقرار کیا،

ترکون نے اس درخواست کو قبول کرنیسے اسوقت تک کیلئے انکار کردیا، جب تک کہ راجہ اپنے تمام مقبوضہ قلعے حوالے نہ کردے، یہ شرط بڑی سخت تھی، راجہ کسی طرح قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوگا، لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ سامان رسد ختم ہوگیا تھا، اور ہر وقت یہ خوف دامنگیر رہتا تھا، کہ ایسا نہ ہو کہ ترک قلعہ فتح کرلین، اس لئے مجبور ہوکر تمام شرطیں قبول کرنی پڑین، اور تمام قلعے خالی کرکے ترکوں کے حوالے کئے، ۵ا ہزار مسلمان جوان قلعوں میں قید تھے، رہائی پاکر مسلمانوں سے آملے،[1]

اس کامیابی نے ترکوں کی ہمت بڑھادی، اسلئے اب دوسرے حریف کے گھر پہنچکر دروازہ پر دستک دی، اس راجہ کا نام "ناتھ رائے" تھا، راجہ نے بھی ہمت کرکے مقابلہ کے لئے فوج کو درست کیا، اور آگے بڑھ کر ترکوں کو روکا، دونوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی، آخر ہندوستانی شکست کھاکر بھاگے، راجہ مارا گیا، پانچہزار ہندوستانی مقتول اور مجروح ہوئے اور بہت سے گرفتار کر لئے گئے، ترکوں نے ان کے مال و اسباب سب لوٹ لئے، اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا اور بے شمار جانوروں پر انھوں نے قبضہ کیا،

جب ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کو یہ حال معلوم ہوا تو سب مطیع ہوگئے، اور اپنے ذمہ کا خراج دربار سلطانی میں روانہ کیا، اور اپنی اپنی سلطنت کی طرف سے حفاظت کیلئے اقرار نامے لکھے،[1]

[1] الکامل جلد نہم ص ۳۵۴، لندن و فرشتہ ص۵۲، و صفحہ ۳۵۴ و صفحہ ۳۵۵، لندن،

۴۴۴ھ میں سلطان مودود نے اپنے ہندوستانی مقبوضات کے دو حصے کر ڈالے، دریائے سندھ کے اس پار ملک کا پایۂ تخت پشاور قرار پایا، اور اس پر اپنے لڑکے منصور کو حاکم بنایا، اور دریائے سندھ کے مشرقی جانب کا دار الامارۃ لاہور بنایا گیا، یہان سلطان کا لڑکا شاہزادہ ابو القاسم محمود حاکم بنا کر بھیجا گیا، اور ابو علی حسن کوتوال غزنہ کو ہندوستان کا سپہ سالار کرکے انکے ساتھ کر دیا، تاکہ سرکش ہندوستانیوں کی بغاوت کا خاتمہ کردے،

ابو علی حسن غزنہ سے چل کر پشاور آیا، اور یہان سے قلعہ ماہ تبلہ روانہ ہوا، قلعہ کے باغی حاکم "ابن" نامی کو جب یہ معلوم ہوا، تو وہ چپ چاپ بھاگ نکلا، اور اس طرح بغیر جنگ کے یہ بغاوت فرو ہوگئی، ہندوؤں کا سردار ہجری ٹیگ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ممتاز لوگوں میں سے تھا، عمر بھر وہ اس بادشاہ کی خدمت کرتا رہا، لیکن اسکی بعض باتوں سے ناراض (یا خوفزدہ) ہوکر غزنہ سے بھاگ آیا، اور کشمیر کے دروں میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا، ابو علی سپہ سالار نے ایک آدمی بھیجکر اس کی غلط فہمی دور کرائی، پھر تسلی اور دلاسا دے کر لاہور لے آیا، دو بدو گفتگو کرکے اسکو مطمئن کیا، اور عہد و پیمان کے بعد غزنہ روانہ کیا، جہاں امیر مودود نے اسکی کافی عزت افزائی کی،

اب ابو علی نے پشاور، لاہور، وغیرہ کے سرکشوں کو مطیع کرکے، اور ملک کا مکمل انتظام درست ہوجانے کے بعد سندھ کا رُخ کیا، جہاں سرکش (غالباً اسماعیلی سومری) لوگوں نے بڑی بدعملی پھیلا رکھی تھی،

سندھ پہونچکر اس نے تمام سرکشوں کی خوب خبر لی، اور حتی الامکان تمام باغیون سے ملک کو پاک کردیا، جب پشاور، لاہور، اور سندھ کا حال قابل اطمینان ہوگیا، تو ابو علی غزنہ واپس چلا گیا،[1]

[1] فرشتہ جلد اول ص۷۹ بمبئی،

۴۴۱ھ میں علی بن ربیع حاجب باغی ہو کر غزنہ سے بھاگ نکلا، اور بزور پشاور اور سندھ پر قابض ہوگیا، لیکن اسی سال کے آخر میں سلطان عبد الرشید نے علی بن ربیع کو دلاسا اور تشفی دیکر پشاور اور سندھ سے واپس بلالیا اور اسکے بجائے حاجب نوشتگین جو بہترین سپہ سالار تھا، اسکو بڑے لشکر کے ساتھ ہندوستان کا والی (نائب الحکومت) بناکر لاہور روانہ کیا، جب لاہور آیا تو اس نے سب سے پہلے ملک کی اس انتظامی چول کو جو ڈھیلی ہوگئی تھی، درست کی، پھر داخلی امور درست کر لینے کے بعد خارجی سیاست کی طرف متوجہ ہوا، غزنوی سلطنت میں خانہ جنگی سے جو خلل پڑ گیا تھا، اس سے سلطنت کا رعب جاتا رہا، اور اسی سبب سے حکام لاہور کو اتنی فرصت نہ ملی، کہ کانگڑہ کا قلعہ واپس لیتے، سپہ سالار نوشتگین کو اس کا بڑا خیال تھا، چنانچہ جیسے ہی اسکو فرصت ملی وہ ایک جرار فوج لیکر نگر کوٹ (کانگڑہ) کی طرف روانہ ہوگیا، قلعہ والوں کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو قلعہ بند ہوگئے، سپہ سالار نے بھی اس کا محاصرہ کر لیا، اور صرف پانچ چھ روز میں اس کو فتح کر ڈالا

سپہ سالار نوشتگین بڑا مدبر شخص تھا، اور کچھ دنوں ہندوستان میں رہ گیا ہوتا، تو ہندوستان میں فتوحات کا دروازہ پھر کھل جاتا، لیکن افسوس کہ سلطان عبد الرشید کے قتل ہوجانے سے ۴۴۳ھ کے آخر میں غزنہ واپس چلا گیا، اور غالباً ۴۵۰ھ تک اس کا نائب ہندوستان پر حکومت کرتا رہا، ۴۵۰ھ میں جب سلطان ابراہیم تخت نشین ہوا، تو اس نے اپنی مملکت کا جدید انتظام کیا، لیکن تاریخوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا، کہ ۴۵۰ھ سے ۴۶۹ھ تک ہندوستان میں کون کون والی (نائب السلطنت) ہوئے،

۴۶۹ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے لڑکے ابوالقاسم محمود کو لاہور روانہ کیا، اس کا مرتبہ اور درجہ بھی بلند کردیا، خاص اس کے لئے غزنہ سے خلعت فاخرہ، گھوڑے اور مرصع ہتھیار روانہ کئے، اس عزت افزائی سے خاص و عام میں اسکی بڑی شہرت ہوگئی، اس نے بھی اپنی اعلیٰ لیاقت

سے باپ کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی، اسی لئے سلطان نے اسکو اپنا ولی عہد قرار دیا،

شاہزادہ محمود بڑا بہادر تھا اس نے اپنی شجاعت کا بڑا سکہ ہندوستان میں بٹھایا، یہ آگرہ تک یلغار کرتا ہوا چلا گیا تھا، چنانچہ مسعود سعد سلمان لاہوری نے جو قصائد اسکی مدح میں لکھے ہیں، اس میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، یہ علم کا بڑا قدر داں تھا، اس کے ساتھ علماء شعراء دربار میں برابر حاضر رہتے،[1]

شاہزادہ محمود کو خلیفہ بغداد القائم متوفی ۴۶۷ھ نے بھی ولی عہد تسلیم کر لیا، اور "سیف الدولہ، عز الملۃ صنیع امیر المومنین" کا خطاب عنایت فرمایا، چنانچہ سرکاری کاغذوں میں اس کا نام اس طرح درج کیا جاتا تھا "سیف الدولہ عز الملۃ ابو القاسم محمود صنیع امیر المومنین"

اس خطاب کے ملنے پر متعدد شعراء نے قصیدے لکھے، اور مبارکباد دی، انہی میں سے مسعود سعد سلمان لاہوری بھی تھا، آخر میں سلطان ابراہیم نے اس کو یہ بھی اجازت دیدی تھی، کہ وہ ہندوستان میں سلطان کے نام کیساتھ خطبوں میں اپنا نام بھی شامل کرلے، اس نے ہندوستان میں ۴۹۲ھ تک حکومت کی،

۴۹۲ھ میں سلطان علاء الدولہ مسعود بن ابراہیم نے اپنے لڑکے شیرزاد کو عضد الدولہ کا خطاب دیکر لاہور بھیجا، ابونصر فارسی اس کا نائب اور سپہ سالار اس کے ساتھ کردیا گیا، اسی نے مسعود سعد سلمان لاہوری کو جالندھر (پنجاب) کی حکومت عطا کی،[2]

عضد الدولہ نے ہندوستان پہونچکر حاکم اور محکوم کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بڑی کوشش کی، اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں، کہ اس کے عہد میں کسی قسم کی بغاوت نہیں ہوئی،

غالباً ۵۰۸ھ میں حاجب طغاتگین کے سپرد ہندوستان ہوا، اس نے لاہور پہونچکر جب ہندوستان کی باگ ہاتھ میں لی ہے، تو دیکھا کہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں تو امن قائم ہے، لیکن

[1] الیٹ جلد ششم ص ۵۵ [2] ضمیمہ ۲ ص ۵۲ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۱۶ء میں پروفیسر براؤن کا مضمون

سرحدی لوگ ہمیشہ دق کیا کرتے ہیں، اس لئے اس نے ایک جرار فوج لیکر گنگا کو عبور کیا، اور تمام سرکشوں کو سزا دے کر ان کے مددگاروں کو دباتا ہوا اس قدر دور نکل گیا کہ سوائے سلطان محمود کے کوئی دوسرا سپہ سالار یہاں تک نہیں پہونچا تھا، طغاتگین یہاں اطمینان کر کے مال غنیمت کیساتھ لاہور واپس آکر انتظام سلطنت میں مشغول ہوگیا،[1]

۵۰۹ھ میں سلطان ارسلان شاہ نے محمد باہلیم کو ہندوستان کا والی (نائب السلطنت) بنایا جس نے لاہور آکر ملک کا بہترین انتظام کیا، کیونکہ اس میں انتظامی قابلیت بڑی اعلیٰ تھی،

۵۱۱ھ میں جب ارسلان شاہ کے مرنے کی خبر ہندوستان پہونچی تو یہاں کے والی کی نیت بدل گئی، اس نے ہر طرح سے اپنے کو تیار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا، بہرام شاہ یہ خبر پاتے ہی بڑی فوج لیکر غزنہ سے ہندوستان آدھمکا، دونوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں بہرام شاہ کامیاب رہا، رمضان ۵۱۲ھ کو محمد باہلیم گرفتار ہو کر بہرام شاہ کے سامنے پیش ہوا، گو اسوقت اسکو قید کا حکم دیا گیا، مگر کچھ دنوں کے بعد اس کی اعلیٰ قابلیت کو دیکھتے ہوئے قید سے رہا کر کے پھر ہندوستان کا والی بنا دیا، اور خود غزنہ واپس چلا گیا،

محمد باہلیم نے جو میدان صاف دیکھا تو پھر اسکی نیت بگڑی، اس نے سوالک کے اطراف میں بھیرہ کے پاس ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام "ناگور" رکھا، اپنے تمام اہل و عیال کو اس قلعہ میں رکھکر خود لشکر جمع کرنے میں مشغول ہوگیا، اس نے چند ہی دنوں میں عرب، عجم، افغان اور خلجی لوگوں کو بھرتی کر کے ایک زبردست فوج تیار کر لی، اور جس قدر سرکش ہندوستانی تھے انکو اس نے کچل ڈالا جب اندرون ملک کی طرف سے اطمینان ہوگیا، تو اس نے پھر خود مختاری کا اعلان کر دیا،

بہرام شاہ یہ سنتے ہی فوج لیکر ہندوستان پہونچ گیا، باہلیم بھی مقابلہ کے لئے تیار تھا ملتان

[1] فرشتہ جلد اول، صفحہ ۴۹ نولکشور،

کے پاس دونوں کی جنگ ہوئی باہلیم کے دس لڑکے تھے، ان سب کو اس نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے، اس وقت ان میں سے دو اس جنگ میں شریک تھے، باپ بیٹوں نے مل کر ایسی سخت جنگ کی، کہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم نظر آتی ہے، لیکن انجام یہ ہوا کہ بہرام شاہ کی فتح ہوئی، اور محمد باہلیم شکست کھا کر بھاگتے ہوئے ایسی جگہ پہنچا، جہاں دلدل تھا، وہ مع اپنے دونوں بیٹوں کے دلدل میں ایسے پھنسے کہ پھر نکل نہ سکے، اور اسی دلدل میں غرق ہوگئے،[1]

یہ دلدل کہاں تھا قابل غور بات ہے، یہ جنگ ملتان کے پاس ہوئی تھی، جہاں جھیلم اور ستلج آکر ملتے ہیں، ممکن ہے کہ انہی دریاؤں کے کنارے کہیں دلدل ہوگیا ہو، جہاں یہ سب غرق ہوے، ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ یہ سب ملتان سے بھاگ کر اچھ جا رہے ہوں کیونکہ اس طرف ملتان کے بعد دوسرا شہر جہاں غنیم سے پناہ مل سکے وہ "اچھ" ہی تھا، اور اچھ ہی کے پاس وہ دریا بہتا ہوا ریت میں غائب ہوگیا ہے، جس کا نام ہکڑا (گھگھر) ہے، عہد قدیم میں ہند اور سندھ کے درمیان یہی دریا حد فاصل تھا، اس قسم کے دریا جہاں ریتوں میں غائب ہو جاتے ہیں، وہاں دلدل پیدا ہو ہی جاتا ہے، پس ہو سکتا ہے، کہ وہ لوگ ادھر آنکلے ہوں، اور اسی دلدل میں غائب ہوگئے ہوں،

بہرحال جب بہرام شاہ فتح یاب ہو کر غزنہ واپس جانے لگا، تو ۵۱۳ھ میں ہندوستان کا والی سالار حسین بن ابراہیم علوی کو بنایا، جس نے غالباً بہرام شاہ کو ہندوستان کی سرحد سے غزنہ کی طرف رخصت کر کے لاہور میں ہندوستان کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اور ہندوستان کا انتظام جو برہم ہوگیا تھا، اس نے اپنے حسن انتظام سے سب کو درست کر دیا، اسی واسطے ہم کہتے ہیں، کہ بہرام شاہ کے آخر زمانہ تک ہندوستان کے متعلق پھر کوئی شکایت نہیں ہوئی،

۵۵۲ھ میں جب خسرو شاہ غزنہ کے تخت پر بیٹھا، تو غوری اسکے سخت ترین دشمن تھے، وہ غزنہ پر

[1] طبقات ناصری صہ ۲۳ کلکتہ و فرشتہ جلد اول صہ ۵۰ نولکشور،

قبضہ کرنا چاہتے تھے اسلئے موقع دیکھکر آگے بڑھے، اور غزنہ پر قابض ہوگئے، خسرو شاہ مجبوراً غزنہ سے ہاتھ دھو لاہور چلا آیا اور اسی کو پایۂ تخت بنایا، سات سال سلطنت کرکے ۵۵۹ھ میں وفات پاگیا، اور غالباً اُسی جگہ دفن ہوا،

۵۵۹ھ میں خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا، غزنہ کا حاکم اس وقت شہاب الدین غوری تھا، جو پیش قدمی کرتا ہوا برابر ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا، چنانچہ ۵۷۷ھ میں وہ لاہور آگیا، مگر بغیر فتح کئے واپس گیا، البتہ سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک قلعہ تعمیر کرکے اپنے ایک افسر حسین خرمیل کو قلعہ دار بنایا، ہندوستان میں غوریوں کا یہ پہلا حاکم ہے،

۵۸۲ھ میں شہاب الدین پھر لاہور آیا، اور خسرو ملک کو گرفتار کرکے غور لیتا گیا، اور اس طرح خاندان غزنہ کا اختتام اور غوریوں کی ابتدا ہوئی،

ہمارے اس بیان سے واضح ہوگیا، کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی محمود غزنوی تھا اور یہ کہ غوریوں کے ہندوستان آنے تک برابر غزنوی سلاطین کا قبضہ ہندوستان پر رہا، اور یکے بادیگرے ان کے حکام ہندوستان آتے رہے،

اکبری دور کا ایک موجد

شاہ فتح اللہ شیرازی

از جناب معین الدین صاحب رہبر فاروقی، (منشی فاضل)

(۲)

اکبر ایک عرصہ سے دکن پر دانت تیز کئے بیٹھا تھا، متعدد سفارتوں اور شہزادوں کے ذریعہ یہاں اپنا اثر جمایا، مگر تاریخ داں جانتے ہیں، کہ ان سارے دکنی سلاطین پر خود مختاری کا رنگ تھا، اور وہ اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتے تھے، اور درحقیقت تھے بھی، ان کے پاس بھی کافی دولت اور فوج تھی اسلئے اس مغل حریف اعظم کا ایک عرصہ تک داؤں نہ چلنے دیا، ان مرزبانانِ دکن میں خاندیس کا حاکم راجہ علی خان عقل و تدبیر کا پتلا تھا، ملک کے نظم و نسق اور سلطنت کی حفاظت میں بڑی پامردی دکھائی اکبر ایک عرصہ سے اسکو مطیع کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اسی سال (۹۹۳ھ میں) خان اعظم کو حکم ہوا کہ وہ ولایتِ دکن کی تاخت کے لئے روانہ ہو، چونکہ شاہ فتح اللہ دکنی سلطنتوں میں رہ کر آئے تھے یہاں کے حالات سے واقف اور صاحب عقل و تدبیر تھے، اس لئے بادشاہ نے اس موقع پر ان کو عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کرکے خان اعظم کیساتھ روانہ کیا، تاکہ حکیم صاحب کے مشہور مالی و ملکی تجربے اور سیاست کی بدولت صوبۂ دکن بھی کامل طور پر سلطنتِ مغلیہ کے زیر نگین ہوجائے، لیکن وہ خاندیس پہونچکر خود سر راجہ علی خان کو راہ راست پر نہ لا سکے، خان اعظم کی کوتہ اندیشیوں سے مہم ناکام ہوئی، اس نے شاہ صاحب کی ایک نہ چلنے دی،

اس ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں میں جو اس کی ہمراہیوں
میں سے تھا، آپس میں نا اتفاقی ہوگئی، راجہ علی خان نے ان کے نفاق سے فائدہ اٹھایا، اور دوسری
دکنی سلطنتوں کو اپنے موافق بنا کر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، میر نے معاملہ درست کرنا چاہا
لیکن جب تدبیر بن نہ آئی، تو خانخاناں کے پاس گجرات پہونچے، کہ اس کی کمک سے اس مہم کو سر
کریں،[1] مگر یہاں پہونچنے کے بعد یہ بھی نہ ہو سکا،

اسی سنہ (۹۹۲ھ) میں اکبر نے کشمیر پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور لاہور ہی میں مقیم رہکر اس
امر میں مشورہ چاہتا تھا، کہ قندھار پر بھی تاخت کیجائے یا نہ کیجائے، اگر کیجائے تو کس راستہ سے اس
مشورہ میں وہ شاہ فتح اللہ کی اصابت رائے پر عمل کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے ان کو اور خانخاناں
دونوں کو طلب کیا، یہ دونوں انتہائی تیزی کے ساتھ پندرہ ہی دن میں لاہور پہونچے،[2]

شاہ صاحب دکن سے آکر اکبر جیسے بے نظیر مردم شناس فرمانروا کی شاہانہ عطوفت سے سات سال
سے زیادہ مسرت اندوز نہ ہو سکے، اگر وہ کچھ دن اور جیتے، تو معلوم نہیں بادشاہ انھیں کس مرتبہ پر پہنچاتا
اور کتنی قدر کرتا، ان کی موت کے واقعات میں لکھا ہے، کہ اکبر نے ۲۲ جمادی الثانی ۹۹۷ھ میں کابل
سے کشمیر کی سیر کا ارادہ کیا، جس کو مغل "باغ خاصہ" کہا کرتے تھے، محلات شاہی کو شاہزادہ مراد کے
ساتھ مقام بھنبھیر میں جہاں سے کشمیر کا کوہستانی راستہ شروع ہوتا ہے، چھوڑا، اور خود یلغار کرتا ہوا
آگے بڑھا، اس سفر میں شاہ صاحب بھی ہمرکاب تھے، یکایک تپ محرقہ میں بیمار ہوئے، بادشاہ
کو اطلاع ہوئی، بے چین ہو گیا، خود بہ نفس نفیس عیادت کو پہونچا، معلوم ہوا حکیم علی گیلانی کا علاج
ہے، اور اس نے معالجہ میں غلطی کی ہے، یہ سن کر میر صاحب کو تسلی اور دلاسا دے کر انھیں شہر میں
چھوڑا، اور خود آگے بڑھا، اور حکیم حسن کو علاج کے لئے بھیجا، اثنائے راہ میں جب زیادہ حالت بگڑنے

[1] مآثر الامراء، جلد اول صفحہ ۱۰۲، [2] دربار اکبری صفحہ ۶۴۴،

کی خبر سنی، تو حکیم مصری کو روانہ کیا، لیکن ان کے پہونچتے پہونچتے شاہ صاحب کا انتقال
ہو گیا، غالباً یہ شوال کی تیسری تاریخ تھی، اور سہ شنبہ کا دن تھا،[1] ع

شہنشاہ جہان را از وفاتش دیدہ پر نم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون عالم شد

صاحب منتخب التواریخ کا بیان ہے، کہ شاہ صاحب چونکہ خود بھی طبیب حاذق تھے،
اسی لئے اپنے مرض کا علاج ہریسہ سے کیا، حکیم گیلانی نے روکا، مگر وہ نہ مانے اجل گریبان گیر تھی، تدبیر الٹی پڑی، اور
کشاں کشاں انھیں دار البقا کو پہونچا دیا،[2] ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

ابو الفضل اور دوسرے مورخین شاہ صاحب کی موت کا الزام بے چارے بدنصیب علی گیلانی کے
سر تھوپتے ہیں، لیکن ملا عبد القادر بدایونی خود ان ہی کی خود رائی کا نتیجہ بتاتے ہیں، واقعہ کچھ بھی ہو، وقت
آگیا تھا، اس لئے چارہ نہ ہو سکے، موت کی خبر سن کر اکبر کے رنج کی انتہا نہ رہی، پہلے خانقاہ میر سید علی
ہمدانی میں سونپا تھا، پھر حکم دیا کہ یہاں سے منتقل کر کے کشمیر کے قریب، کوہ سلیمان کے بہشت زار
دامن میں سلایا جائے، چنانچہ اس پہاڑ پر سید عبد اللہ خان چوگان بیگی کی قبر کے پہلو میں انھیں سپرد
خاک کیا گیا، کسی نے تاریخ وفات "فرشتہ بود" (۹۹۷) کہی،

شاہ کی موت کا حادثہ معمولی واقعہ نہ تھا کہ دنیا کو اس کا احساس نہ ہوتا، اس کی عظمت کا حال
ابو الفضل سے پوچھئے، دربار کے نورتنوں سے سنئے، جن کی گردنیں اس کے ذکر کے آگے جھک جاتی
تھیں، ان سب کے مربی شہنشاہ اکبر کے دل سے پوچھئے، ابو الفضل نے اکبر نامہ میں شہنشاہ کے
جو جذبات اس فاضل عصر کی وفات پر لکھے ہیں، ان سے آج بھی اس یگانہ روزگار حکیم کی فضیلت و عظمت
کا اندازہ ہوتا ہے،

[1] "لطائف فیاضی" قلمی، [2] منتخب التواریخ، صفحہ ۳۶۹،

بندہ مبارک لکھتا ہے،

"از سوانح، سپری شدن روزگارِ عضد الدولہ، از بیماری در شہر گذاشتہ بودند، بہ سرنوشتِ آسمانی حکیم علی را در مُداوا لغزشے رفت، جہان سالار، حکیم حسن را، بہ چارہ گری فرستاد، دریں ولا او بہ اردوے ہمایوں پیوست، روشن شد کہ ازین سپنجی سرا دل برگرفت، پادشاہِ پایہ شناس را از گذشتن آن یادگار حکماے پیشیں، اندوہ درگرفت و بارہا بر قدسی زبان رفت کہ "میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود، اندازہ سوگواری ما کہ تواند شناخت اگر بہ دستِ فرنگ افتادے[۵۱] و ہمگی خزائن عوض خواستے، بہ آرزو آن سودائے فراوان، سود کردمے، وآن گرامی گوہر را بسا ارزان اندوختے۔"

این چراغ انجمن ہستی، چنان می دانست کہ قافلہ دبستان دانش را یکبارہ رہ زدہ اند، از دیدن این معنوی بزرگ دریافتہ، دگرگونگی پذیرفت بہ آن مایہ شناسائی در راستی و درستی و معاملہ دانی نایاب گوہرے بود، فرمان شد کہ از خانقاہ میر سید علی ہمدانی برداشتہ، فرازِ کوہ سلیمان کہ دل کشا جائے است نگاہ دارند۔"[۵۲]

فیضی نے ان کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کے پڑھنے سے دل دہل جاتا ہے، اس مرثیہ میں (۴۳) اشعار ہیں، چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

ایزد کہ ساخت عقلِ تو گنجینۂ نہان،	ہستی دو قفل ماند ترا، بر درِ زبان
دانستہ کہ این ہمہ قفل از برائے چیست	تا گنج خانہ را، بہ کشائی زمان زمان
بر خفتگانِ خاک، بہ خواری نظر مکن	شیران، بہ روے خاک نہ خسپند جاودان
ہر نطفہ کہ زاد، ز آدم، نہ آدمی ست	ہر سنگِ اصفہان نہ بود کحلِ اصفہان

[۵۱] دیکھئے اس وقت بھی اکبر کے دور میں فرنگیوں کی قدر شناسی مشہور تھی، [۵۲] اکبر نامہ جلد سوم ص۵۵۸۔

بنگر طریق پائے، ز سرکردگانِ فقر	سر بر زمین و توسنِ افلاک زیرِ ران
ہشیار گام نہ، کہ درین پہنِ بادیہ،	ہر خار بُن بہ قصدِ تو شیرے بود ژیان
دیدی کہ در مصافِ بہ افگندنِ حریف	پہلو بہ روے خاک نہد، مردِ پہلوان
از حرص تا بہ چند زبون گیر خود شدن	بر ناتوانِ خویش، بہ بخشائے ناتوان
بر ملک و مال غرّہ مشو، کامہاتِ دہر	اقبال زادہ اند، باد بار تو امان
در سرگذشتِ ملک، بہ عبرت نظارہ کن	کاندر فلان زمان بفلان آمد از فلان
دہقان بخاک، بہر کفن پنبہ کاشت ست	مسکیں پدر بزاد فرزند کامران
اُبرآن بُود، کہ سیل برد، خانہ تُرا	باد آن بُود، کہ در زند آتش بخان و مان
عطار گو بہ بند دُکان کز اثر گذشت	کردم ہزار بار عقاقیرش امتحان
جل الخناق گیر و گلو بند، و گریہ کن	حب السعال ریز بہ منقار ماکیان
قارورہ خورد کن، بہ سرِ نا طبیب شہر	نشتر بزن، بدیدۂ نصّاد قلتبان
چندیں حکیم دور خیالِ بلند فہم	قرّانی عناصر و اجرام را ضمان
مستدعیٔ اجل، بہ نہاں خانہاے خاک	بر و آن یگانہ ہاے جہان رایگان مگان
زآن ہا، دو نامؑ در خلفِ الصدقِ روزگار	کافلاک، شان نہ زاد، بہ جل و صد قران
اوّل امامِ دین، عضد الدولہ بحرِ علم	قرّاءِ حقیقت و علامۂ زمان
شاہِ سہیل ناصیہ، فتح اللہ آن کہ عقل	با چرخ آفتاب نہد پلہ اش گران
در جنبِ پرتوِ خردِ دور بین او،	بنمود، نور مشعلۂ عقل کل، دُخان

[۵۳] یہ واضح رہے کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے کچھ ہی دنوں بعد اس سفر میں اکبر کا ایک اور عزیز ترین حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھی انتقال ہوا تھا، اس لئے اس مرثیہ میں ان دونوں کا ذکر ہے،

از حکمت الٰہی او عقل مستفید، — وز دقّت ریاضی او غیب متہاں

در پیش چشم من کہ پر از خاک دہر باد — در عرض ہفتہ ہر دو گذشتہ ناگہاں

بودم دران سفر من بدروز تیرہ بخت — از کف عناں گسل، بہ رکاب خدایگان

لیکن چو در حقیقت ایں کار بنگرم — آیے ست این تراوش باویست این فغاں

ہرگز نہ مردہ اند، و نہ میرند اہل دل — حرفے ست نام مرگ بریں قوم ترجماں

بر قدر روح پیر ہنے بیش نیست تن — گیرد چو کہنہ گشت سپہر کہن ستاں

فیضی سخن زمید، فیاض می کند — دانستہ خموش، نہ دانستہ بداں

دارو فروش ہندم و کس نیست بجز من

دانندۂ مزاج تر و خشک، بحر و کاں[۱]،

ایک اور مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں،

گرامی اُمّہات فضل را فرزند روحانی — ابو الآبائے معنی شاہ فتح اللہ شیرازی

دو صد بو نصر رفت و بو علی تا او پدید آمد — بسے دارد قضا، ورنہ دکان زین گونہ بزازی

گہے با محمل مشائیان گرد زمیں گردی — گہے با موکب اشراقیاں گرد فلک تازی

مباہات از وجود کامل او بود دوراں را

بدوران جلال الدین محمد اکبر غازی[۲]

مسلمان موجدوں کے حالات ہماری قوم کو بہت کم معلوم ہیں، اور ادھر لوگوں نے توجہ بہت کم کی ہے، ارباب علم کو اس اہم پہلو کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اسلاف کے یہ کارنامے ہماری آیندہ نسلوں کے لئے نمونۂ عمل کا کام دیں، حکیم موصوف کی عظمت کا سرمایہ صرف

[۱] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۰۶ پر پورا مرثیہ ملاحظہ فرمائیے، [۲] منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۷۰،

علم و فضل ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے عہد کے ایشیا کے بڑے موجدین میں تھے، آیندہ سطور میں ان کی بعض قابل فخر ایجادات بیان کیجاتی ہیں،

(۱) حکیم صاحب نے اپنے کمالات سے ایک ایسی چکی بنائی تھی، جو خود بخود ہوا سے حرکت کرتی تھی، اور آٹا پیسا جاتا تھا، فارسی مورخین اس کا نام "بادآسیا" لکھتے ہیں، غالباً یہ اسی قبیل کی کوئی چکی ہوگی جسے انگریزی میں "ونڈ مل" (Wind Mill) کہتے ہیں اور جو ہالینڈ میں عام طور پر پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں یہ امر لائق غور ہے کہ ہالینڈ نے یہ چکی ایجاد کی یا شاہ صاحب نے، پہلی صورت میں شاہ صاحب کو اس کا علم تھا، اور ان کی ایجاد ویسی ہی تھی جیسی ہالینڈ کی، یا کوئی فرق تھا، ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے، کہ اکبر کے دور میں ہندوستان میں انگریزوں کی کافی آمد و رفت تھی، بلکہ اس نے ان کو اپنے دربار تک میں جگہ دی تھی، خود اس کی ایک مغربی بیوی تھی، اگر حکیم صاحب کی یہ ایجاد کوئی اہمیت نہ رکھتی اور اسی قبیل کی ہوتی جیسی کہ ہالینڈ کی ہوتی تھی، تو ضرور اس ایجاد و کمال کی عظمت گھٹ جاتی، اور مغربی نو وارد اکبر کی نظروں سے اس کمال کی وقعت گرا دیتے، مگر جہاں "بادآسیا" کا ذکر ہے، وہاں کسی نے کچھ نہیں لکھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ شاہ صاحب ہی سب سے پہلے ونڈ مل کے موجد ہیں، اور ممکن ہے کہ موجودہ ہوائی چکیوں سے جداگانہ اور کمال و صنعت گری خرچ کر کے شاہ فتح اللہ نے یہ چکی بنائی ہو، افسوس ہے کہ شاہ صاحب کے معاصر مورخین نے عبارت میں اس کا کوئی تفصیلی نقشہ نہیں کھینچا ہے اور نہ اسکے متعلق خاطر خواہ لکھا ہے، البتہ آثار اکبری سے (جو فتح پور سیکری میں اکبر کے آثار کا تذکرہ ہے) اس چکی کے وجود اور اس کے محل وقوع کا پتہ چلتا اور تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ مؤلف کے اصل الفاظ یہ ہیں،:-

"اس موضع چرپاری میں پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر ایک عمارت کے کچھ آثار باقی ہیں، جو "پون چکی" کے نام سے مشہور ہیں، ایک ہشت پہل گچ کا مکان ہے جس کا ہر ضلع فیٹ

۴۔ انچ، اور قطر ۱۹ فیٹ ہے، ہر پہل میں ایک دروازہ ہے، چھت لداؤ کی ہے، جس کے اوپر ۳ فیٹ ۴ انچ بلند سنگین چبوترہ ہے، یہ چبوترہ بھی ہشت پہل ہے، جس کا ہر ضلع ۱۰ فیٹ ۱۰ انچ ہے، آس پاس اور بھی عمارت کے آثار ہیں، بہت سے سنگین اور منقش ستون، اور پتھر ادھر ادھر پڑے نظر آتے ہیں، فارسی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ میر فتح اللہ شیرازی نے فتح پور میں پون چکی بنائی تھی، جو ہوا سے خود چلتی تھی، غالباً یہ اسی چکی کی عمارت ہے۔[1]

۲۔ اسی فتح پور میں حکیم صاحب نے اپنا ایک حکیمانہ محل بنا رکھا تھا، مؤلف آثار اکبری اسکی نشان دہی دیوان عام کی جنوبی دیوار سے سکھ تال تک کے مکانات سے جو "حکیم کے مکان" سے موسوم ہیں، کرتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ غالباً یہی میر فتح اللہ شیرازی کا مکان ہے[2] شہر فتح پور اور ان کے مکان کو دیکھ کر فیضی نے اکبر کو جو عرضی لکھی، اس میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے،:-

"از حقیقت شہر چہ نویسد، عمارت گلیں ہمہ داخل زمیں شدہ، دیوار ہائے سنگین ایستادہ بہ آتش خانہ ہا و خانہ ہا را، بعضے از دور و بعضے از نزدیک نظارہ کرد و عبرت گرفت خصوصاً از خانہ میر فتح اللہ شیرازی کہ بہ آبستن نہ صد سال مادر ایام او را زادہ بود، دیدبۂ الٰہی بود کہ بہ حضرت کرامت فرمودہ بودند"[3]

۳۔ میر صاحب نے ایک آئینہ ایجاد کیا تھا، جو نزدیک اور دور کے عجیب و غریب تماشے دکھاتا تھا، ممکن ہے یہ دوربین کی قسم ہی ہو، یا اکبر کے لئے سکندر کے آئینہ کی طرح کوئی آئینہ بنایا ہو، افسوس

[1] آثار اکبری مطبوعہ مطبع اکبری آگرہ ص ۱۰۰، مؤلف نے یہ کتاب ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں لکھی ہے، اور انھوں نے اسی زمانہ میں بذات خود تحقیقات کرکے یہ کتاب لکھی ہے، [2] آثار اکبری ص ۱۳۰، [3] یہ وہ عرضداشت ہے، جس کو فیضی نے خاندیس سے اکبر کی خدمت میں بھیجا ہے، "لطیفہ فیاضی" میں جو فیضی کے منشآت کا مجموعہ ہے، اور خود آزاد کی دربار اکبری میں صفحہ ۳۹۹ پر اس عرضی کی نقل موجود ہے،

کہ اس سے زیادہ اسکی کوئی تفصیل نہیں،[1]

۴۔ ایک عجیب قلعہ شکن توپ بنائی تھی، جس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں،:-

"توپ ہے کہ تخت پر چڑھی ہے، جیسی (قلعہ شکن) توپ ہی، پہاڑ سامنے آجائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ، ہاتھوں ہاتھ اٹھاکر چڑھ جاؤ،"[2]

۵۔ توپ کیساتھ، ایسی ہی بے مثل بارہ ضربی بندوق بھی ایجاد کی تھی، جو ایک ہی فیر میں بارہ گولیاں چلاتی تھی، جس کی ایجاد کا سہرہ غالباً عوام مغرب اور موجودہ دنیا کے سر باندھتے ہیں، ان ایجادوں کی تصدیق آج بھی قدیم مطبوعہ و غیر مطبوعہ تاریخوں سے کیجا سکتی ہے، چنانچہ شاہ صاحب کا ہم عصر مورخ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں لکھتا ہے،:-

امیر فتح اللہ (با آن کہ در جمیع علوم عقلی و نقلی در ایران و ہند بل در ربع مسکوں قرین خود نہ داشت) از نیر نجات و طلسمات ماہر بود آسیاے ساختہ کہ خود حرکت می کرد، و آدمی شد و آئینہ درست کرد کہ از دور و نزدیک اشکال غریبہ مرئی می گشت، و آن کہ بہ یک چرخ دوازدہ بندوق سر می شد نیز از اختراع اوست"[3]

اگر میر سا فرزانہ روزگار اپنی علمی یادگاریں نہ چھوڑتا، تو بڑا رنج ہوتا کہ جب تک وہ زندہ رہا، اپنے وقت کے لوگوں تک اپنا فیض پہونچایا، لیکن اسکی ایجادیں سب کی سب اسکے ساتھ رخصت ہوگئیں، آنے والی نسلیں جب اسکی یاد تازہ کرتیں، تو دیکھتیں کہ اس نے اپنے اخلاف کے لئے اپنے بیش بہا علم و کمال کی کیا دوامی یادگاریں چھوڑیں، مورخین لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں، مگر ملتی کم ہیں، جو کچھ ہیں وہ سند ہیں،

[1] دربار اکبری ص ۶۸۱، [2] ایضاً ص ۶۸۱، [3] طبقات اکبری مطبوعہ نولکشور ص ۳۸۹، و مآثر الامرا مطبوعہ کلکتہ جلد اول ص ۱۰۱،

آزاد نے دربار اکبری میں جہاں ان کا حال لکھا ہے، ان کی تصنیفات سے صرف خلاصۃ المنہج اور منہج الصادقین کے نام درج کئے ہیں، اور ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں، کہ "یہ ہند میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں" یہ دونوں کتابیں فن تفسیر میں ہیں، ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اور صاحب طبقات شاہ جہانی نے بھی ان کے حالات لکھتے ہوئے لکھا ہے، کہ انھوں نے ایک تفسیر لکھی تھی،[1] مگر نام درج نہیں کیا، ہمارے علم میں انکے جتنے علمی کارنامے آئے ہیں، ان کی تفصیل ذیل میں درج کیجاتی ہے،

۱۔ تفسیر منہاج الصادقین فی الزام المخالفین" یہ تفسیر فارسی زبان میں پانچ جلدوں میں لکھی گئی ہے، اس کے مفسر کا نام ملا فتح اللہ کاشانی لکھا ہے،[2] یہ کتاب جسے آزاد ہند میں کم یاب و نایاب فرماتے ہیں؛ بمقام دار السلطنت اصفہان شاہ ناصر الدین قاچار کے عہد حکومت میں حاجی شیخ رضا طہرانی وحاجی ملا علی اکبر کتب فروش کے اہتمام سے) ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں بہت بڑے سائز پر خط نسخ میں مکمل چھپ چکی ہے، ہم نے اس کے متعدد قلمی نسخے بھی دیکھے ہیں، ملا صاحب تفسیر کے دیباچہ میں، اور اسباب تالیف کے سوا ایک وجہ یہ بھی لکھتے ہیں، "چونکہ شیعہ مذہب کے خلاف تفسیریں لکھی گئی ہیں، جو اس فرقہ کے عقائد سے متضاد ہیں، اس لئے میں نے یہ تفسیر لکھی، دیباچہ کا بیان ان ہی کے الفاظ میں سنئے کہ اس میں شاہ صاحب کے قلم سے کچھ حقیقت کا اظہار بھی ٹپک پڑا ہے،

پس معلوم شد کہ علم قرآن اصل علوم شریعت است ودانستن آن ضرور وچونکہ بعضے از عجم

[1] طبقات شاہ جہانی قلمی ص ۲۹۲ کتب خانۂ آصفیہ، [2] ہم جن فتح اللہ کا حال لکھ رہے ہیں، وہ شیراز کے رہنے والے ہیں، لیکن اس تفسیر میں "کاشانی" لکھا ہے، یہ تحقیق طلب ہے کہ دونوں میں کون سا بیان صحیح ہے، اکبر کے دور میں اور بھی فتح اللہ نامی اشخاص گذرے ہیں، جنھیں دامن شاہی سے وابستگی حاصل تھی، ساتویں ابو الفتح گیلانی تو الگ ہی رہے، ان میں ایک حکیم بھی تھے، جو فتح اللہ گیلانی کہلاتے تھے، جنکی ایک کتاب ترجمہ کلیات قانون بھی ہے، جو نولکشور سے چھپ چکی ہے، اس میں انھوں نے اپنے آپکو شیرازی لکھا ہے اور جسکا سنہ تصنیف ۱۰۰۷ھ ہے

از مطالعہ تفاسیر عربیہ عاجز بودند، واز تفاسیر فارسیہ متعلقہ بہرہ نہ داشتند تا بہ واسطہ آں کہ بعضے ازاں بہ جہت تفاصیل جمیع لغات وماخذ ومشتقات آن، وذکر وجوہ ترکیبات باہرہا وبیان .... کہ مطالعہ آن موجب کلال می شد، .... وبعضے دیگر بجہت الفاظ فرس قدیم واسلوب نامربوط، وعبارت نامستقیم باعث ملال، وبرخے دیگر درغایت اختصار کہ ازاں فائدہ تامہ حاصل نمی شد، وتفسیر کاشفی اگرچہ بجواہر عبارات بلیغہ ولآلی الفاظ بلیغہ فصیحہ محلی بود، اما چون کہ موافق روش مخالفین، ومخالف مذہب ائمہ صادقین بود (صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین،) در نظر اعتبار، بہ مثابہ مار زرنگار می نمود، چہ ظاہر ایں مزین بود، بہ نقوش جمیلہ، وباطنش مملو از سموم عقائد قاتلہ، وباوجود ایں، درغایت ایجاز واختصار،

بنا بر علی ہذا، بہ خاطر فاتر ایں فقیر ضعیف، مانی المفتقر الی غفران اللہ اللطیف السبحانی ابن شکر اللہ فتح اللہ الشریف کاشانی، .... رسید کہ تقربا الی اللہ تعالیٰ وطلباً لمرضاتہ العلی مطالعہ تفاسیر عربیہ وفارسیہ وکتب تواریخ واحادیث وغیر آں، از کتب کلامیہ واصول وفروع فقیہ کردہ تفسیرے ازاں انتخاب نماید..... چوں مقصد اقصیٰ ومطلب اعلیٰ ازیں منتخب، ایضاح طریقہ ائمہ صادقین است بہ حجج واضحہ والزام مخالفین بہ براہین باہرہ ازیں جہت مسمی شد بہ منہج الصادقین فی الزام المخالفین وبر پنج جلد ترتیب یافت بعدد آل عبا"

۲۔ خلاصۃ المنہج، یہ کتاب اول الذکر تفسیر کا خلاصہ ہے، چونکہ تفسیر منہاج الصادقین ایک ضخیم ومبسوط کتاب تھی، جس کا مطالعہ مصروفیت رکھنے والے اصحاب اور عوام کے لئے دقت طلب تھا، اس لئے اس تفسیر کا ایک ضروری خلاصہ لکھا، جس میں صرف ترجمہ اور کچھ ضروری باتیں درج

ہیں، نام بھی تفسیری نام کے لحاظ سے "خلاصۃ المنہج" ہے، اس کتاب سے بھی شاہ صاحب کی تمہید کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ فرمائیے،

"چوں بتائید ربانی و توفیق سبحانی منہج الصادقین فی الزام المخالفین فی الروایات المحققین کہ محتوی بر پنج مجلد است مرتقی بر صد و ہشتاد ہزار بیت کہ بر ترتیبے کامل و تالیفے شامل است اختتام پذیرفت، و بنظر کیمیا اثر بعضے از خواص اخوان دینی ...... رسیدہ عز قبول یافت، بخاطر فاتر مؤلف و جامع المفتقر الی الغفران ربہ اللطیف السبحانی ابن شکر اللہ، فتح اللہ الشریف الکاشانی ...... رسید"

اس کتاب کا ایک نسخہ ہماری نظر سے گذرا، جو ربیع الاول سنہ ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ ہے، خاتمہ کی عبارت ہے:-

"قد افرغ من تحریر ھذہ الرابع اول التفسیر الشریف المبارکہ علی ید الفقیر الحقیر الی اللہ الغنی۔ ملا محمد طاہر اردستانی نائب قاضی بندر مچھلی پٹن فی حادی عشرین شہر ذی قعدۃ الحرام سنہ ۱۰۹۰ھ" [۱]

۳- اکبر نے سنہ ۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ہجرت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، اس لئے ایک ایسی تاریخ لکھی جائے، جو ابتدا سے آجتک کے تمام بادشاہان اسلام کے حالات پر حاوی ہو، اور اپنے معلومات کے لحاظ سے تمام تاریخوں کی ناسخ کہی جا سکے، اس کا نام بھی "تاریخ الفی" رکھا جائے، چنانچہ حسب فرمان اس کام کے لئے سات آدمی مقرر ہوئے، پہلا دور نقیب خاں سے متعلق ہوا، دوسرے کے لئے شاہ فتح اللہ مامور ہوئے، اسی طرح حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، مرزا نظام الدین احمد اور ملا عبد القادر بدایونی نے عہد بعہد کے حالات لکھ کر اس کتاب

[۱] یہ خلاصۃ المنہج بھی کتب خانۂ آصفیہ میں فن تفسیر فارسی قلمی نمبر (۶۳۰) پر موجود ہے،

کی تکمیل کی [۱]، یہ تاریخ نہایت ہی کمیاب ہے، اور ہندوستان میں اس کے صرف دو تین ہی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے،

۴- اکبر کے حالات میں خود شاہ فتح اللہ نے ایک تاریخ الگ مرتب کی تھی، اور اس کا نام اقبال نامۂ اکبری رکھا تھا، اس کتاب کا کچھ صحیح پتہ نہیں چلتا، صرف اس کا نام سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ میں ہمیں ملا، اس میں اکبری دور کی تاریخوں کے ذکر کے ضمن میں شاہ صاحب کی اس تالیف کا پتہ چلتا ہے،

۵و۶- آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ انھوں نے کشمیر کے حالات پر ایک رسالہ لکھا تھا، جو بادشاہ کے حسب الحکم اکبرنامہ میں شامل کیا گیا، زیچ جدید کے نام سے تاریخ الٰہی اکبر شاہی کا ایک حصہ بھی ان کی نگرانی میں لکھا گیا تھا، [۲]

[۱] منتخب التواریخ جلد ۲ صفحہ ۳۱۹، [۲] دربار اکبری صفحہ ۶۸۰ و صفحہ ۶۸۱،

تلخیص و تبصرہ

قرونِ وسطیٰ میں کتابوں کے ساتھ مسلمانوں کا شغف

ذیل کا مضمون ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب کے ایک مقالہ کا خلاصہ ہے، جو اسلامک کلچر بابت اپریل ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا ہے:-

اسلام کا ابتدائی دور مختلف تمدنوں کے اتصال کا دور تھا، جو بعد میں مہذب دنیا کے ایک بڑے حصہ کے لئے حد درجہ اہم ثابت ہوا، اس عہد میں ایک مخلوط تمدن نہایت تیزی کیساتھ پیدا ہو گیا، جسکو عربی تہذیب یا اسلامی کلچر کہتے ہیں، اس تمدن کی تعمیر میں مختلف قوموں نے حصہ لیا، عربوں نے اپنے مذہب اور اپنی بے مثل زبان کا حصہ پیش کیا، ایرانیوں نے ہر قسم کے فلسفیانہ تخیل اور علوم و فنون کی تحصیل کے لئے اپنی نمایاں ذکاوت اور قابلیت کیساتھ شرکت کی، اور ترک اپنی انتظامی قابلیت عملی کاموں کے لئے اپنی موزونیت اور اسلام کی خدمت کیلئے اپنی فوجی قوت لائے،

عربوں کی حکومت نے جو بہتیرے ملکوں اور قوموں پر تھی، علٰحدگی کی سرحدیں توڑ ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات اور نصب العینوں کے مبادلہ نے قدامت پسندی کی قوت کو کمزور کر دیا، اکثر آدمیوں کے دماغ، خواہ وہ کسی قومیت سے تعلق رکھتے رہے ہوں، بندشوں سے آزاد ہو گئے، اور فکر و عمل کی دنیا میں نئی نئی راہیں پیدا کرنے لگے، چنانچہ اسلام کے عہدِ زرین میں مادی خوشحالی کے اور ذہنی سرگرمی ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہے، مسلمان نہ صرف قیصر و کسریٰ اور خاقان کی دولتوں کے

وارث ہو گئے، بلکہ یونان، ایران، اور ہندوستان کی حکمت کی وراثت بھی ان کے حصہ میں آ گئی، بقول پروفیسر نکلسن علم کا ذوق اس قدر بڑھا ہوا، اور عالمگیر تھا، کہ معلوم ہوتا تھا، گویا ساری دنیا خلیفہ سے لیکر حقیر سے حقیر شہری تک دفعتہً طالب علم یا کم از کم علم و ادب کی سرپرست بن گئی ہو،

جب بنو عباس نے بغداد کو دار الخلافہ بنایا، تو انھوں نے اپنی سرپرستی سے ہر قسم کے ادبی سائنٹفک اور فلسفیانہ علوم کو بہت کچھ ترقی دی، خلیفہ مامون کا عہد اس مشرقی نشاۃ ثانیہ کے پورے شباب کا دور تھا اس نے قدما کی تصانیف کو تلاش کرا کے فراہم کیا، اور ترجمہ کے لئے سائنس اور فلسفہ کی کتابیں حاصل کرنے کی غرض سے ایک وفد اپنے ہم عصر رومن شہنشاہ کی خدمت میں بھی بھیجا، چنانچہ ایک قلیل مدت میں یونان، ایران اور ہندوستان کی خاص خاص علمی و ادبی اور فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہو گئے، مامون نے بغداد میں ایک بیت الحکمت قائم کیا اور اس میں علم و ادب کے فاضلوں کو مقرر کیا، اس ادارہ میں ایک رصد خانہ اور ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، اسلام کے قرونِ وسطیٰ میں کتابوں کے ایک منتظم اور جامع ذخیرہ کی یہ پہلی مثال ہے، اس کے بعد دار الخلافہ اور دوسرے مرکزوں میں بھی اس قسم کے بہت سے ادارے قائم ہو گئے اور انکی شہرت عالمگیر ہو گئی،

اسلام کے دورِ عروج میں جو علمی اور ادبی تحریک شروع ہوئی، اسکے ساتھ کتابوں کا شوق بھی لوگوں میں انتہا درجہ کا پیدا ہو گیا، ماہر فن کاتبوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی، جو بیش بہا کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے، ان کے علاوہ چھوٹے درجہ کے کاتب بھی تھے، جو عام افادہ کی کتابیں اوسط معاوضہ پر نقل کیا کرتے تھے، تاکہ معمولی حیثیت کا طالب علم بھی انھیں خرید سکے، اس طرح کتابوں کی نقلیں تیزی کیساتھ بڑھتی گئیں، اور چھوٹے بڑے کتب خانے قائم ہونے لگے، خلفاء اور بادشاہوں نے مثالیں قائم کیں، اور انکی تقلید ذی علم امراء اور دوسرے علم دوستوں نے بھی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ کتب خانے قائم ہو گئے، اور مسجدوں، مدرسوں، ہسپتالوں، مہمان سراؤں اور اسی قسم کے دوسرے

اداروں کی طرح کتب خانوں نے بھی مسلم سوسائٹی کی تمدنی زندگی میں ایک اہم جگہ حاصل کر لی، چند مشہور کتب خانوں اور کتاب کے شائقوں کے ذکر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اسلامی مشرق میں فن کاغذ سازی کے رواج پر کچھ روشنی ڈالی جائے، قدما زیادہ تر ایک خاص قسم کے کاغذ پر لکھتے تھے، جو پاپائرس (Papyrus) نامی ایک پودے کے ریشہ سے بنایا جاتا تھا، اس کاغذ کو پاپائرس کہتے تھے، اور اس کا عربی نام "بردی" ہے، اس کے بعد بھیڑ اور بکری کی کھالیں کاغذ کے طور پر استعمال کی جانے لگیں، مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ان دونوں قسم کے کاغذوں کو استعمال کیا، چنانچہ عربی پاپائرس کی ایک خاصی بڑی تعداد گذشتہ ساٹھ سالوں میں مصر میں کھود کر نکالی گئی ہے، جس سے اس ملک کے قدیم عرب نظام حکومت پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے تیار کیا ہوا چمڑہ زیادہ قیمتی ہونیکی وجہ سے صرف سرکاری کاغذات یا قرآن مجید کے لکھنے میں استعمال کیا جاتا تھا، کاغذ کی جو شکل آج ہمارے سامنے ہے، اسکے بانی اہل چین ہیں، ریشم اور ریشم کے فضلہ سے کاغذ بنانے کا فن قدیم زمانہ میں انہی نے دریافت اور استعمال کیا، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً ایک صدی بعد ایک چینی عہدہ دار نے جس کا نام تسائی لون (Tsai Lun) تھا، کاغذ سازی میں سن چیتھڑے، اور چینی گھاس کو استعمال کرکے اس صنعت کو بڑی ترقی دی اور اس کی لاگت میں بہت زیادہ تخفیف پیدا کر دی، عرب تاجر جو مشرق بعید سے تجارت کیا کرتے تھے، چینی کاغذ اپنے ملک میں لانے لگے، مگر خود اسلامی دنیا میں کاغذ بنانے کی صنعت ایک اتفاقی واقعہ سے جاری ہوگئی، ۷۵۱ء میں عربوں نے سمرقند کو فتح کیا، قیدیوں میں ایک تعداد چینیوں کی بھی تھی، جو ترکوں کی حمایت میں عربوں سے لڑتے تھے، ان قیدیوں نے عربوں کے زیر حکومت سمرقند میں کاغذ سازی کا کام شروع کر دیا یہ صنعت کامیاب ہوئی، اور سمرقند کی ایک قیمتی صنعت بن گئی، عرب سلطنت میں پہلا شہر جس کا تعلق کاغذ سازی سے ہوا سمرقند ہی تھا،

تھوڑے ہی دنوں میں یہ صنعت عرب سلطنت کے مرکزی صوبوں میں بھی پھیل گئی، چنانچہ فضل ابن یحیٰی مشہور برمکی وزیر نے کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ بغداد میں قائم کیا، یہ صنعت اس قدر کامیاب ہوئی کہ چند ہی سال بعد اس کے بھائی جعفر بن یحیٰی نے چرمی کاغذ کے بجائے معمولی کاغذ کا استعمال سرکاری دفتروں میں جاری کر دیا، عراق سے یہ صنعت شام اور مصر پہونچی، اور وہاں سے مراکش اور اسپین کاغذ کی مانگ اس کے ارزاں ہونے کی وجہ سے اسقدر بڑھی کہ اس کے کارخانے اسلامی دنیا کے تقریباً ہر شہر میں ہوگئے" عربوں نے کاغذ کے بنانے میں روئی اور دوسری نباتات کے ریشے استعمال کرنے شروع کئے، چونکہ مختلف چیزوں سے کاغذ بنایا جانے لگا، اس لئے تیار شدہ کاغذ کی بھی مختلف قسمیں پیدا ہوگئیں، چنانچہ ابن الندیم صاحب فہرست نے چھ قسم کے کاغذوں سے واقفیت ظاہر کی ہے،

کاغذ سازی کی صنعت کو اپنی سلطنت میں رائج کرکے عربوں نے نہ صرف اپنے علوم و فنون کی اشاعت کو ترقی دی، بلکہ یورپین تہذیب کی عموماً اور قدیم یونانی، اور رومن لٹریچر کی خصوصاً ایک بڑی خدمت انجام دی، اس طرح کہ پہلے یورپ میں کاغذ کی برآمد کی، اور پھر خود کاغذ سازی کی صنعت کو اندلس اور صقلیہ کی راہ سے وہاں جاری کیا، قرون وسطیٰ میں یورپ کے لوگ بہت دنوں تک صرف چمڑے پر لکھا کرتے تھے، قیمتی ہونے کی وجہ سے اس پر زیادہ کتابیں لکھی نہیں جا سکتی تھیں، عموماً یہ اتنی قیمتی اور نادر چیز تھی، کہ چمڑے پر یونان و روما کے قدیم مصنفین کی جو کتابیں لکھی ہوئی تھیں انہیں مٹا مٹا کر ارباب کلیسا اسی چمڑے پر اپنے حمد و وظائف لکھا کرتے تھے، ان قدیم تصنیفات کو مٹانے اور ضائع کرنے کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، اور خدا ہی جانتا ہے، کہ اس طرح کتنے بے بہا خزانے جہالت کی قربانگاہ کی نذر ہوگئے، اگر اہل یورپ کو معلوم بھی ہوتا، کہ چین کے لوگ ریشم سے کاغذ بناتے ہیں، تو بھی وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، کیونکہ وہ اس وقت تک ریشم کے پیدا کرنے کے طریقہ سے ناواقف تھے، عرب نہ صرف کاغذ کو یورپ میں لائے، بلکہ انہوں نے اسپین میں روئی کی

کاشت بھی جاری کی، جس سے مغرب میں کاغذ سازی کی صنعت وجود میں آئی، اس وقت تک روئی کا پودا یورپ میں نامعلوم تھا،

اب اس تاریکی سے نکل کر جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ پر طاری تھی، مشرق کی اسلامی دنیا میں آئے جہاں مسلمانوں کے علوم و فنون کی روشنی دور دور پھیلی ہوئی تھی، خلیفہ مامون کے بیت الحکمت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کا کتب خانہ تمام علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ تھا، اور یہ کتب خانہ ۱۲۵۸ء تک قائم رہا، جب کہ بغداد مغلوں کے ہاتھوں خاک میں مل گیا، خلیفہ کی مثال کی تقلید بہت سے امرا اور اہلِ دولت نے کی، اور انہوں نے اپنی جیب خاص سے بغداد اور دوسرے مقامات پر علمی ادارے اور کتب خانے قائم کئے، مثلاً علی بن یحییٰ (متوفی ۲۷۵ھ) نے جو المنجم کے لقب سے مشہور ہے، بغداد کے متصل اپنے قلعہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، اور اس کا نام خزانۃ الحکمت رکھا، اسکی کتابوں کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے، اور ان لوگوں کے قیام و طعام کا انتظام بھی بانی کتب خانہ کی طرف سے تھا، اس کتب خانہ میں خاص طور پر علم ہیئت کی کتابیں زیادہ تھیں، اسی طرح ۳۸۳ھ میں وزیر ابو نصر صبور بن اردشیر نے بھی بغداد میں ایک دار العلم قائم کر کے اس میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا، بیان کیا جاتا ہے، کہ اسکی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ جلدوں سے زیادہ تھی، جن میں سے بعض اس زمانہ کے ممتاز ترین خوشنویسوں کی لکھی ہوئی تھیں، بغداد کے تقریباً ہر مدرسہ کے ساتھ کوئی بڑا یا چھوٹا کتب خانہ شامل تھا، مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ کے کتب خانے اپنی وسعت اور کتابوں کی قیمتی حیثیت کے لحاظ سے خاص طور پر مشہور تھے، کتب خانوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی، یہانتک کہ ساتویں صدی ہجری میں صرف بغداد میں کم سے کم (۳۶) کتب خانے موجود تھے، ذاتی کتب خانے ان کے علاوہ تھے، جو حد شمار سے باہر ہیں،

کتب خانے صرف بغداد تک محدود نہ تھے، بلکہ اسلامی دنیا کے تقریباً ہر تمدنی مرکز میں قائم

ہو گئے، دولتِ عباسیہ کے زوال پر جب سلطنت میں بہت سی خود مختار اور نیم خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں، اسوقت بھی تمدنی زندگی میں کوئی انحطاط نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس کے برعکس مختلف حکمرانوں نے اسکو ترقی دی، اور اس میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوشش کرتے رہے، چنانچہ اسپین میں امویوں، مصر میں فاطمیوں، حلب میں ہمدانیوں، ایران میں آل بویہ، بخارا میں سامانیوں اور افغانستان میں غزنویوں نے کتب خانوں کے ذریعہ علوم کی ترقی میں خاص طور پر کوشش کی، اہمیت اور شہرت کے لحاظ سے خلیفہ مامون کے بیت الحکمت کے تقریباً برابر ہی فاطمی خلیفہ الحاکم کا دار العلم تھا، جسے اُسنے خاص کر اپنے شیعی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ۳۹۵ھ میں قاہرہ میں قائم کیا، اس میں ایک کتب خانہ بھی تھا، جو نادر کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ تھا، شاہی کتب خانہ علحدہ تھا، جو محل کے اندر تھا، بیان کیا جاتا ہے، کہ ایک وقت میں اس شاہی کتب خانہ میں بیس لاکھ جلدیں تھیں، بعض بعض کتابوں کی بیسیوں نقلیں موجود تھیں، صرف قرآن مجید کے (۲۴۰۰) مطلا نسخے تھے، بہت سے نادر قلمی نسخوں کے علاوہ جو ابن مقلہ اور دوسرے مشہور خوشنویسوں کے لکھے ہوئے تھے، عربی کے بعض مشہور ترین مصنفوں کی تصنیفیں خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کتب خانہ میں محفوظ تھیں، مثلاً کتاب العین خلیل بن احمد، تاریخ طبری امام ابو جعفر طبری، اس کی تیس نقلیں تھیں،

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دنیا کا تیسرا عظیم الشان کتب خانہ اموی خلیفہ الحکم ثانی (۹۶۱-۷۶ء) کا قرطبہ میں تھا، اس خلیفہ کو کتابوں کا بیحد شوق تھا، اور اس کے ایجنٹ اسکندریہ، قاہرہ اور بغداد کے کتب فروشوں کی دکانوں پر نادر نسخوں کی تلاش میں پھرا کرتے تھے، جب کوئی کتاب قیمتہً حاصل نہ ہو سکتی، تو وہ اسکی نقل کرا لیتا، بعض اوقات ایسا ہوتا، کہ یہ سن کر کہ فلان شخص فلان کتاب لکھنے کا قصد کر رہا ہے، وہ اُس شخص کے پاس کوئی قیمتی تحفہ بطور نذر کے بھیجدیتا، اور یہ درخواست کرتا، کہ کتاب کا پہلا نسخہ اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ کتاب الاغانی کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لئے جو ابو الفرج

الاصفہانی اس وقت عراق میں لکھ رہا تھا، خلیفہ نے اس کے پاس ایک ہزار دینار بطور ہدیہ کے بھیجے، ان ذرائع سے اس نے چار لاکھ کتابیں جمع کرلیں، اسے کتابوں کے صرف جمع کرنے کا شوق نہ تھا، بلکہ اس نے ان میں سے بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا، اور ان پر حاشیے بھی لکھے تھے،

کتابوں کے باب میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کا بھی یہی حال تھا، محمود غزنوی سے قطع نظر کرکے جس کا دربار اس عہد میں شعراء اور اہل علم کا خاص مرکز تھا، ملکی فرمانرواؤں میں غلام خاندان کا سلطان ناصر الدین خاص طور پر مشہور صاحب علم اور علوم وفنون کا بڑا سرپرست گذرا ہے، بادشاہی کی حالت میں بھی وہ ایک طالب علم و درویش کی زندگی بسر کرتا تھا، اور کتابت کی اجرت سے اپنے ذاتی اخراجات پورے کرتا تھا، مغل شہنشاہوں کا علمی ذوق بھی بہت بڑھا ہوا تھا، بابر کی خود نوشت سوانحعمری ایک قیمتی تاریخی ماخذ ہے، ہمایوں کو کتابوں سے اس قدر محبت تھی، کہ اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں بھی جب وہ ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا، انھیں اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا، اکبر اگرچہ لکھا پڑھا نہ تھا، تاہم اس نے کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ جمع کرلیا تھا، اور شام کے وقت کتابیں پڑھواکر سنا کرتا تھا، اس کے خاص حکم سے بہت سی کتابیں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں، جہانگیر، شاہجہان، اورنگ زیب نیز خاندان تیموریہ کے اور بہت سے شہزادے بڑے تعلیم یافتہ اور کتابوں کے بڑے شائق تھے، آج بھی یورپ اور ہندوستان کے پبلک اور پرائیویٹ کتب خانوں میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں، جن پر ان کے دستخط یا مہریں ثبت ہیں،

علوم کے ان شاہی سرپرستوں کی تقلید ان کی رعایا بھی کرتی تھی اور بہت سے لوگ تو کتابوں کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اسلام کی تاریخ میں کوئی عہد اور کوئی ملک خواہ کتنا ہی زوال پذیر کیوں نہ ہو، ایسا نہیں ہے، جو اس قسم کے لوگوں سے کلیتہً خالی رہا ہو، سوڈان اور سینیگال جیسے ملکوں میں بھی کتب خانے اور کتابوں کے شائق آج تک موجود ہیں،

عربوں نے کتابوں کا ذکر ہمیشہ عزت اور محبت کیساتھ کیا ہے، اور انھیں اپنا وفادار دوست سمجھا ہے، عربی زبان کا کوئی مجموعۂ نظم مشکل ہی سے ایسا ملے گا، جس میں کتاب کی مدح میں اشعار نہ ہوں، متنبی کہتا ہے،

أعز مكان في الدنى سرج سابح — وخير جليس في الزمان كتاب

"دنیا میں سب سے زیادہ معزز جگہ صبا رفتار گھوڑے کی زین ہے، اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے"، المہلبی نے جو سلطان معزالدولہ (آل بویہ) کا وزیر تھا، اپنے بیٹوں کو یہ نصیحت کی تھی، "جب تم بازار جاؤ تو صرف ایسی دوکان پر کھڑے ہو جہاں اسلحہ بکتے ہوں یا کتابیں"

کسی ملک میں کتابوں کی تجارت سے بھی وہاں کے لوگوں کی علمی زندگی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، مورخ یعقوبی کا بیان ہے، کہ اس کے زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری میں صرف بغداد میں کم سے کم ایک سو کتب فروش تھے، ان کی دوکانیں ایک خاص سڑک پر تھیں، جسکو سوق الوراقین کہتے تھے، کتب فروشوں میں اکثر مشہور خوشنویس اور اہل ادب بھی ہوتے تھے، ان کی دوکانیں صرف کتابوں کا ذخیرہ نہ تھیں، بلکہ علمی مرکز بھی تھیں، جہاں طلبہ اور اہل علم جمع ہو کر کتابوں کو جانچتے تھے، اور ان کی قدر وقیمت پر بحث کرتے تھے،

"ع ز"

اخبار علمیۃ

دنیا کی سب سے بڑی نمائش

آئندہ سال نیویارک میں ایک ایسی نمائش ہونیوالی ہے، جو سائنس کی ترقیوں کا ایک بے مثل مظاہرہ ہوگی، اس نمائش گاہ میں سڑکیں جھیلیں پل جنگل زمین وغیرہ سائنس کی کرشمہ سازیوں کے نمونے ہونگی، جس زمین پر یہ نمائش ہو رہی ہے، وہ اب سے دو سال قبل دلدل تھی، لیکن سائنسدانوں کی دو سال مسلسل کوششوں کے بعد اب وہ قابلِ زراعت اور زرخیز بنادی گئی ہے، انھوں نے پہلے اسے ہل سے جوتا، پھر چونے کی آمیزش کرکے فاسفیٹ اور نائٹروجن ملایا، آخر میں کھاد ڈالدی، ان تدبیروں سے یہ زمین حسب خواہش تیار ہوگئی ہے،

نمائش میں قدرتی مناظر پیدا کرنے کے لئے ایک جنگل لگایا گیا ہے، جہان سینکڑون میل سے درخت لاکر نصب کئے جارہے ہیں، بعض درخت جو باہر سے لائے گئے ہیں، وزن میں ۲۵ ٹن اور طول میں پچاس فیٹ سے زیادہ ہیں،

اس احاطہ میں سترہ میل کی سڑکیں، پندرہ میل کی گیس کی ندی، دس پل اور دو مصنوعی جھیلیں بنائی جائیں گی، ایک بحری بندرگاہ بھی ہوگا، جہان دریائی موٹر اور جہاز زمین سے آلگیں گے،

بعض عمارتیں بھی عجیب وغریب بن رہی ہیں، ایک عمارت اس ساخت کی ہے، کہ انجینیر جس طرح چاہیں، اسکو آسانی کے ساتھ سمیٹ سکیں گے، دوسری عمارت بیضاوی شکل کی ہے، جو ۰۰۰ فیٹ ہوا میں

بلند ہے، اسکی بنیاد کے وقت جو لکڑیان دی گئیں، وہ گیارہ میل تک پھیلی ہوئی تھیں، تیسری کی شکل بالکل گیند سی ہے، جس کا قطر ۲۰۰ فیٹ ہے، یہ عمارتیں میلوں کے فاصلہ سے دکھائی دیتی ہیں، اور نمائش کے ناظرین کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہون گی، ان کی تعمیر کے اخراجات کا تخمینہ ۱۲ لاکھ ڈالر ہے،

گیند نما عمارت میں "جادو کا قالین" ہوگا، جو نمائش دیکھنے والوں کو مستقبل کے شہر اور گاؤن کے نمونے دکھانے کے لئے اوپر لے جائیگا، یہ جادو کا قالین موٹن کا ایک پلیٹ فارم ہوگا، جب اس پر لوگ بیٹھ جائین گے، تو یہ اوپر کی طرف دائرہ کی شکل میں اٹھنے لگیگا، یہ قالین ستونوں پر قائم ہوگا، لیکن اس پر کچھ اس ترتیب سے روشنی ڈالی جائے گی، کہ ستون مطلق نظر نہ آئیں گے، اور یہ جادو کا قالین آہستہ آہستہ ایک منٹ میں تیس فیٹ کا حلقہ بناتا رہیگا، جس سے بظاہر یہ عمارت گیند کی طرح فضا میں تیرتی نظر آئے گی، رات کو اس عمارت کے باہر روشنی کی رنگین اور گھومتی ہوئی شعاعیں پڑتی رہینگی، جس سے عمارت گھومتی ہوئی معلوم ہوگی، یہ پانچ منزلوں کی عمارت ہوگی، جس کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک بہت ہی لمبا زینہ ہے، جو خود بخود چلتا رہتا ہے، اس کے ذریعہ سے ایک گھنٹہ میں سولہ ہزار آدمی اوپر جا سکتے ہیں، اترنے کے لئے ایک گول زینہ ہے، جہان سے نمائش کے تمام مناظر نظر آتے ہیں،

نصف درجن کی مختلف قسم کی گیسوں کی روشنیان نمائش میں بیک وقت پھیلی ہوئی ہون گی، یہ کوشش بھی کیجا رہی ہے، کہ آگ اور پانی کو ملا کر فوارے اور رنگین شعلے دکھائے جائین، خیال ہے کہ نمائش کے چھ مہینے کی مدت میں نصف کرور کیوبک فیٹ کی گیس خرچ ہوگی،

سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ریل گاڑیوں کی نمائش ہوگی، ایک گول کمرہ کے اندر ایک پورے سائز کی ریل گاڑی چلتی نظر آئے گی، ایک دوسرے کمرہ میں جو ۱۰۰×۱۵۰ فیٹ کا ہوگا، ریلوے لائن کا مکمل مظاہرہ ہوگا، چھوٹی چھوٹی گاڑیان انجن اسٹیشن سگنل، پھاٹک، اور پل وغیرہ سب باضابطہ

ہون گے، اور نقل و حمل کے تمام مدارج دکھائے جائیں گے،

ایک ہزار مربع فیٹ کا ایک گیہوں کا کھیت بھی ہوگا جس میں گیہوں بونے کے وقت سے لیکر روٹی پکنے تک کے تمام مدارج دکھائے جائیں گے، اسی طرح مختلف صنعتوں، مثلاً موٹر گاڑیوں کی تیاری کے تمام مراحل نظر کے سامنے ہوں گے، سائنس کے مختلف معمل برابر کام کرتے رہیں گے، فوٹوگرافی سے شوق رکھنے والے معمولی تصویر کشی سے لیکر پورے فلم کی تیاری تک کو دیکھ سکین گے،

طب اور صحت عامہ کا شعبہ بھی عجیب و غریب ہوگا، ایک کمرہ کے اندر اٹھارہ فیٹ کا ایک مصنوعی انسان کھڑا ہوگا، جس کے دل کی حرکت کی آواز کو سب تماشائی سن رہے ہون گے، اس کے ذریعہ سے بڑے پیمانہ پر انسان کے دل اور اس کی حرکتوں کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے بغل میں معمولی قد کے انسان کے مجسمے ہوں گے، جن میں مختلف انسانی اعضا نہایت صاف دکھائی دین گے، یہ تمام اعضا زندہ انسانون کے اعضا کی طرح کام کرتے ہون گے، اور غذا کی تحلیل پسینے کے نکلنے، آنکھ اور کان کے افعال، جسم کے نمو، متعدی امراض کے پھیلنے وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویرین ہون گی،

ریاست ہائے متحدہ کی موت اور پیدائش کی شرح موٹر کی دوڑ کی تصویر کے ذریعہ سے دکھائی جائے گی، اس دوڑ میں کبھی موت اور زندگی ساتھ دوڑتی ہوں گی، کبھی پیدائش آگے بڑھتی نظر آئے گی، اس مظاہرہ سے یہ بھی ظاہر کیا جائے گا، کہ سائنس اور طب بچّون کے موت کے روکنے اور انسانی زندگی کو بڑھانے میں کس حد تک معاون ہوئی ہین،

ان عجائبات میں تماشائیون کی نظر ایک عظیم الشان "جماہی لینے والے منہ" پر پڑے گی، جس کے اندر آدھے درجن آدمی بیک وقت داخل ہونے کے بعد وہ ایک قالین پر چلتے نظر آئیں گے، جو اصل میں انسانی زبان ہوگی، اس کے چاروں طرف وہ شفاف دانتون کی قطارین دیکھیں گے، جن

شریانوں میں خون دوڑتا ہوگا، دانتوں کی جڑون میں شریانون کو کام کرتے بھی دیکھ سکیں گے، بچّون کے دانت کس طرح نکلتے ہیں، پھر عمر کیساتھ کس طرح بڑھتے رہتے ہیں، اور آخر میں کس طرح گر جاتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوں گے،

ہر قسم کی آب و ہوا کی ایک جگہ

پیرس کے ڈاکٹر گولڈمرسٹین اور برلن کے پروفیسر کارل اسٹوڈیک نے نیویارک کی ایک سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے اپنی صحت گاہ کی تجویزین پیش کی ہیں، جہاں ایک ساتھ صحت بخش غسل کیلئے تمام دنیا کے مشہور جھرنون کے پانی، اور پہاڑ اور سمندر کے ساحل جیسی آب و ہوا کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہوگا،

یہ گھر ایک شیشہ کی عمارت کے اندر واقع ہوگا جسکا رقبہ ۲½ ایکڑ ہوگا اور جسکی تعمیر میں ۰ لاکھ ڈالر خرچ ہونگے اسمیں داخل ہونیکے لئے ایک قلیل سی رقم ادا کرنی ہوگی، اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع کمرہ نظر آئیگا، جسمیں رات اور دن مصنوعی آفتاب کی شعاعیں چمکتی رہیں گی، اسکے بعد ایک تیرنے کا حوض ہوگا، جسکے اوپر ریت بھاپ کے ذریعہ سے گرم رکھی جائیگی، یہان تیرنے والے ارکسٹرا کی موسیقی اور آفتاب کی صحت بخش شعاعوں سے لطف اندوز ہوسکین گے، اوپر بادل چلتے نظر آئیں گے، تیرنے کے بعد گرم کمروں میں داخل ہونیسے کپڑے اور جسم فوراً خشک ہوجائیں گے،

اسی کے پہلو میں بعض کمرے اور خیمے ہوں گے، جہاں معدنی پانی، گرم ہوا، بھاپ، اکس ریز اور آفتاب کی روشنی سے ہر قسم کے صحت بخش غسل کئے جاسکیں گے، پھر حسب خواہش دوسرے کمروں میں فلوریڈا کی خوشگوار اریزونا اور نیو میکسیکو کی خشک ہوا ملیگی، اور اس کے ساتھ ہی زیکوسلاوکیا کے کارلسباڈ فرانس کے ویشی، نیویارک کے سیرٹوگا کے جھرنوں، اور ورجنیا کے گندھک کا پانی دستیاب ہوگا،

اس کے علاوہ اس کے اندر پانچ جمنازیم، ایک تھیٹر، اور ایک میل سے زیادہ ٹہلنے کی جگہ ہوگی، اور مختلف کھیلون کے میچ کا بھی سامان ہوگا،

"ص ع"

مطبوعاتِ جدیدہ

محبوبِ خدا، مؤلفہ جناب چودھری افضل حق صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور،

اس سے پہلے جناب افضل حق صاحب کی ایک تصنیف "زندگی" اپنی معنوی خوبیوں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکی ہے، اب انھوں نے جیل کی فرصت میں دوسری کتاب محبوبِ خدا کے نام سے سیرتِ طیبہ پر لکھی ہے، سیرت پر آئے دن کتابیں نکلتی رہتی ہیں، اسلئے ان میں کوئی نمایاں امتیازی پہلو پیدا کرنا بہت مشکل ہے، لیکن مؤلف کے جوشِ عقیدت اور والہانہ اندازِ تحریر نے کتاب مذکور میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے، سیرت کے واقعات کیساتھ ان سے سبق آموز نتائج نکالے گئے ہیں، اور جابجا اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب دینی اور دنیوی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کے لئے سبق آموز بن گئی ہے، طرز تحریر پر جوش اور والہانہ ہے، کہیں کہیں زبان "سیرت نگاری" کی ثقاہت کے پایہ سے گر گئی ہے،

وفاق ہند، از خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، علاوہ محصول ڈاک، پتہ اردو لٹریچر کمپنی، دہلی،

اردو میں جدید دستور کا خلاصہ غالباً سب سے پہلے مکتبہ جامعہ نے کتابی صورت میں شائع کیا، لیکن وہ نہایت مختصر تھا، ڈاکٹر نجم الدین صاحب جعفری نے وفاقِ ہند کے نام سے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، اس میں آئینِ جدید کے تمام ضروری ابواب آگئے ہیں، آغاز کتاب میں سر شاہ سلیمان کا پیش

لفظ ہے، تمہید میں وفاقی حکومت کی تعریف، اس کے اقسام مختلف ملکوں میں اس کے تجربے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد کی مختصر تاریخ ہے، جس سے ہندوستان کی آئینی تاریخ سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس کے بعد اصل کتاب میں جدید دستور کے تمام ابواب ہیں، اگرچہ یہ نہایت خشک موضوع ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے طرز تحریر نے اسکو دلچسپ اور خوشگوار بنا دیا ہے، انگریزی نہ جاننے والوں کے لئے کتاب خصوصیت کیساتھ زیادہ مفید ہے،

دلّی کا سنبھالا، مصنفہ جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۵۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

دلّی کا سہاگ دولت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی لٹ گیا تھا، لیکن آخری دور کی اجڑی ہوئی دلی بھی مشرقی تہذیب کا مرکز اور ہر صنف کے اربابِ کمال کا مخزن تھی، خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے مذکورۂ بالا کتاب میں اس خزان رسیدہ دور کی آخری بہار دکھائی ہے، اور اس دور کے ہر طبقہ کے اربابِ کمال کے کمالات، ان کی خصوصیات اور تہذیب کو دلی کی پرانی پاکیزہ اور ستھری زبان میں اس خوبی سے دکھایا ہے، کہ مٹی ہوئی بہار کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے، یہ کتاب زبان کی لطافت اور واقعات کی مصوری دونوں حیثیتوں سے لائق قدر ہے، زبان کے ایسے بہتر نمونے اب کم نظر آتے ہیں،

فکر و نشاط، جناب جوش ملیح آبادی، تقطیع اوسط ضخامت ۱۱۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نفیس، قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی،

فکر و نشاط جناب جوش ملیح آبادی کے منظومات کا تازہ مجموعہ ہے، ان کے کلام کا رنگ اور اسکی خصوصیات معروف و مشہور ہیں، معارف میں اس سے پہلے ان کے کلام پر تفصیلی ریویو بھی ہو چکا ہے، اس لئے اس مجموعہ پر تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس مجموعہ کے رنگ کلام

میں ایک خاص قابل ذکر تغیر نظر آرہا ہے، وہ یہ کہ پہلے جناب جوش محض "شبابیات" کے نقیب تھے، انکا کلام جوانی کی رنگینیوں اور جنون خیزیوں کی تفسیر ہوتا تھا، اب غالباً کچھ بہ تقاضائے عمر اور کچھ مشق و مہارت کی پختگی سے فکر و تدبر اور سنجیدگی و متانت اسکی جگہ لے رہی ہیں، چنانچہ اس مجموعہ میں جس میں چھوٹی بڑی ۸۲ نظمیں ہیں، بیشتر سنجیدہ موضوعوں پر ہیں، لیکن رنگینی جوش کی سرشت میں داخل ہے، اور ان کی شاعری کی زمین ہی گلنار واقع ہوئی ہے، اسلئے یہ مجموعہ بھی رنگین بیانیوں سے خالی نہیں ہے، اور سنجیدہ نظموں میں بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں، تاہم اس کی بے اعتدالیاں بڑی حد تک گھٹ گئی ہیں، غالباً اسی تغیر کی بنا پر اس مجموعے کا نام "فکر و نشاط" رکھا گیا ہے، باقی جوش کی زبان و بیان کی خصوصیات اس میں بھی وہی ہیں، جو لوگ مست شباب جوش کی رعنائیاں دیکھ چکے ہیں، انھیں یہ افکار سلیم بھی دیکھنے چاہئیں،

مخدوم الملک مولفہ جناب سید احمد صاحب بہاری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۴؍ پتہ رشید اینڈ کمپنی بہار شریف پٹنہ،

اس رسالہ میں مؤلف نے حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کے مختصر حالات آپ کے مجاہدات مدارج سلوک اور بعض مذہبی اور صوفیانہ تعلیمات لکھے ہیں، آخر میں آپکے عرس کے مراسم اور تقریبات کا ذکر ہے، زبان اچھی نہیں،

روحی فداک از جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی، تقطیع اوسط ضخامت ۱۱۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸؍ پتہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ،

روحی فداک مصر کے ایک مشہور اہل قلم خلیل آفندی اڈیٹر "الاہرام" کا پرانا ناول ہے، یہ ایک پاک اور سچے عشق اور اس راہ میں قربانی اور جانفروشی کی درد انگیز داستان ہے، جناب محوی صدیقی نے عرصہ ہوا اسکا ترجمہ کیا تھا افسانہ دلچسپ ہے، ترجمہ کی خوبی کیلئے جناب محوی کا نام بہت کافی ہے،

"م"